اجراء حسبِ ارشاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہ

مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر: ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۴ | ذی القعدہ ۱۴۴۴ھ | جون ۲۰۲۳ء | شمارہ ۶

السّلام التحقیق

ثمرہ کمالِ اسلام (قسط دوم)

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۵۰ روپے | زرسالانہ =/۶۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

السَّلام لتحقیق

(ثمرہ کمالِ اسلام) قسط دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ مدرسہ سروٹ ضلع مظفر نگر میں ۱۲ شوال ۱۳۴۰ ہجری ۹ جون ۱۸۲۲ء کو ''ثمرات اسلام کامل'' کے موضوع پر تخت کے اوپر ایک کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ وعظ صبح ۶ بج کر ۳۹ منٹ پر شروع اور ۹ بج کر ۳۳ منٹ پر ختم ہوا۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ (مقیم میرٹھ محلہ کرم علی) نے اسے قلمبند کیا جبکہ سامعین کی تعداد ۲۵۰ تھی۔ اس سے قبل ایک وعظ میں حضرت نے اسلام کی حقیقت بیان کر کے اسلام حقیقی کی ترغیب دی تھی اور مفصل کلام کیا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ اسلام کے بیان کے ساتھ اس کے ثمرہ کا بھی بیان کر دیا جائے تا کہ سننے والوں کو رغبت ہو۔ اس وعظ میں تفصیل سے ثمرات اسلام کو بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نوٹ: اس وعظ کی پہلی قسط کا آخری عنوان (آج کل لوگوں کے اخلاق اور تواضع) تھا اور اس دوسری اور آخری قسط کا پہلا عنوان (اہل اللہ کے اخلاق) ہے۔

خلیل احمد تھانوی

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اہل اللہ کے اخلاق	۷
۲	اخلاق حقیقی	۷
۳	اہل اللہ کی لطافت	۱۰
۴	آخرت ایک بازار ہے	۱۲
۵	ترغیب حصول اسلام کامل	۱۳
۶	عورتوں کی میراث ہڑپ کرنے کا انوکھا طریقہ	۱۴
۷	آج کل رسوم کی حالت	۱۵
۸	جوتیوں کا صدقہ	۱۶
۹	اعمال کا صلہ	۱۷
۱۰	آیت افک پر ایک اشکال کا جواب	۱۸
۱۱	قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت	۲۰
۱۲	بدگمانی میں احتیاط	۲۱
۱۳	فقہ کا ایک ضابطہ	۲۲
۱۴	لعان اور اس کا حکم	۲۲
۱۵	لعان کا طریقہ	۲۳
۱۶	کسی عورت پر تہمت لگانا سخت کبیرہ گناہ ہے	۲۴
۱۷	صحیح النسب ہونے کے لیے وجود نکاح کافی ہے	۲۶
۱۸	قانون کی اہمیت	۲۷
۱۹	لفظ عند کا معنی	۲۸
۲۰	قرب کے درجات	۲۹

۲۱.....	رویت بے حجاب ہونے کا مفہوم.....	۳۰
۲۲.....	عاشق کا مذاق.....	۳۱
۲۳.....	حق تعالیٰ کا ادراک	۳۱
۲۴.....	ولی کا معنی.....	۳۳
۲۵.....	محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں.....	۳۳
۲۶.....	محبوبیت کو محبیت لازم ہے.....	۳۶
۲۷.....	راحت کی روح.....	۳۷
۲۸.....	جنت میں انتظار کی لذت ہوگی.....	۳۹
۲۹.....	لفظ محبت کی ضروری تحقیق.....	۴۱
۳۰.....	محبت کی بناء.....	۴۲
۳۱.....	بغیر اعمال صالحہ کے صرف محبت کافی نہیں.....	۴۴
۳۲.....	محبت کے لیے محض میلان قلب کافی نہیں.....	۴۴
۳۳.....	نسبت مطلوبہ.....	۴۵
۳۴.....	نسبت باطنی کو بلا اعمال کے کافی سمجھنا غلط ہے.....	۴۵
۳۵.....	نسبت کی اقسام.....	۴۶
۳۶.....	نسبت محمود.....	۴۷
۳۷.....	محبوب حقیقی کے مالی مطالبہ کی کیفیت.....	۴۸
۳۸.....	محبت میں چین کہاں.....	۵۱
۳۹.....	اجزائے دین کا طریق تکمیل.....	۵۲
۴۰.....	بیداری اور ہمت کی ضرورت.....	۵۳
۴۱.....	التماس.....	۵۴
۴۲.....	اخبار الجامعہ.....	۵۵

نوٹ: گزشتہ وعظ کا آخری عنوان (آج کل لوگوں کے اخلاق اور تواضع) تھا

اہل اللہ کے اخلاق

صاحبو! اخلاق اور ہی چیز ہیں صرف صورت بنا لینے کا نام اخلاق نہیں، اخلاق تو وہ ہیں جو دل میں ہوں بزرگوں میں یہی اخلاق ہوتے ہیں کہ جڑ تو ان کی دل میں ہوتی ہے اور آثار ان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتے ہیں مگر نہ اتنا جتنا کہ اہل تصنع میں ہوتا ہے اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دہلوی مکہ معظّمہ کو ہجرت کر گئے تھے ان کا گھر مکہ معظّمہ میں نے بھی دیکھا ہے بہت گلیوں کے اندر ہے ان کی عادت یہ تھی کہ جو کچھ روپیہ پیسہ ان کے پاس تھا وہ سب ایک تھیلی میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اس میں روپیہ بھی ہوتے اور دونی بھی اور چونی (۱) بھی غرض جو کچھ نقد ان کے پاس تھا وہ سب اس تھیلی میں تھا، جب بازار جاتے تب بھی وہ تھیلی ساتھ جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کچھ محبت اہل اللہ کو نہیں ہوتی کوئی دنیا دار ہوتا تو مال کو چھپا کر رکھتا، زمین میں گاڑ دیتا یا صندوق میں تالا لگا کر رکھتا مگر یہاں کچھ بھی نہیں اس کی پرواہی نہیں کہ کوئی دیکھ لے گا اور چھین لے گا یا چرا لے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اخلاق حقیقی

ایک دن بازار سے کچھ خریدا اور دام (۲) نکالنے کے لیے ساری تھیلی الٹ دی، دام کی قدر (۳) نکال کر باقی پھر اس میں بھر لیا، کسی بدو کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ ساتھ ہو لیا جب وہ گلیوں میں پہنچے تو ایک دم اس تھیلی کو ان کے ہاتھ سے چھین بھاگا، ان حضرت نے اتنی بھی پرواہ نہ کی کہ اس کا تعاقب کرتے یا غل مچا دیتے (۴) تو محلّہ میں سے آدمی نکل آتے اور اس بدو سے تھیلی چھین لیتے یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ان کا

(۱) ایک روپے میں ۱۶ آنے ہوتے تھے دو آنے کے سکہ کو دونی اور ۴ آنے کے سکے کو چونی کہتے تھے (۲) پیسے دینے کے لیے (۳) جتنے پیسے دینے تھے دئے (۴) شور۔

تھیلی کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا مال کی محبت کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ بعض دنیاداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ اشرفیاں (۱) بازو پر باندھے رہتے ہیں کیونکہ وہ ان کو نہایت محبوب ہوتی ہیں ذرا دیر کو بھی ان کا جدا کرنا گوارا نہیں کرتے، یہاں تو دنیا سے کچھ تعلق ہی نہ تھا تھیلی جاتی رہی جاتی رہی یہ اپنے گھر میں آ گئے قدرت خدا دیکھئے کہ دنیا دار کیا کچھ حفاظت کرتے ہیں تالے صندوق پہرہ چوکی رکھتے ہیں اور یہاں کچھ بھی نہ تھا مگر یہاں خدائی پہرہ تھا بدو وہ تھیلی لے تو گیا مگر اب اس کو گلیوں میں راستہ نہیں ملتا، جدھر جاتا ہے، ادھر گلی بند، ہمایوں کے مقبرہ کی بھول بھلیاں ہوگئی کہ اس میں چلے تو جاؤ مگر نکل نہیں سکتے، بے چارہ بہت حیران پھرا مگر راستہ نہیں ملا اب تو ہوش درست ہوئے اور سمجھا کہ یہ کوئی خدا کا بندہ ہے۔ مصرع

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

دنیادار ایسے لوگوں کے معتقد جوتے کے زور سے ہوتے ہیں اسی واسطے دیکھا ہوگا کہ آج کل لوگ مجذوبوں کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں کیونکہ وہ سیدھی طرح بات نہیں کرتے گالیاں دیتے ہیں، پتھر مارتے ہیں واہی تباہی بکتے ہیں سو ان کی خوشامدیں ہوتی ہیں ہاتھ جوڑے جاتے ہیں اور رہے بیچارے مولوی تو گھنٹوں سر ماریں، اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین بیان کریں مگر کسی کو بھی اعتقاد نہیں ہوتا اور وہ ڈنڈے مارتے ہیں اور اعتقاد بڑھتا جاتا ہے غرض سیدوں کی پوچھ نہیں جب کوئی دباؤ پڑتا ہے تب اعتقاد ہوتا ہے۔

آخر وہ بدو روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے اسی گھر پر گیا جس میں شاہ صاحب گئے تھے اور پکارا اپنی تھیلی لے لو مگر خبرے نباشد (۲) کئی بار پکارا مگر جواب نہیں ملا، پکار کر کہا معاف ہی کردو مگر خبر ندارد (۳)۔ اب یہ سمجھے کہ میں نے تمام حجت کر دیا اب میرے اوپر کوئی الزام نہیں رہا اگر کسی کو لینا ہوتا تو لے لیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاف کر دیا یہ خبر نہیں کہ ان کا محافظ کوئی اور ہے اس کی معافی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ معاف بھی کر دیں تو وہ معاف نہیں کرتا بعض جرائم کی مدعی (۴) سرکار ہوتی ہے ان میں صاحب حق

(۱) سونے کا ایک سکہ (۲) کوئی جواب نہیں آیا (۳) کسی نے خبر نہ لی (۴) دعویدار۔

کے معاف کرنے سے بھی مجرم بری نہیں ہوتا۔ خیر اس نے سمجھا کہ میں اپنا کام کر چکا اور تھیلی لے کر چلا لیکن راستہ پھر نہیں ملتا، اب بہت پریشان ہوا۔ ایک اور تدبیر نکالی کہ محلّہ میں کھڑے ہو کر غل مچایا کہ دوڑیو مجھے لوٹ لیا اور مجھ پر ظلم کیا محلے والے نکل آئے کہ کیا بات ہے، پوچھا کس نے ظلم کیا، کہا یہ شخص جو اس گھر میں رہتا ہے اس نے ظلم کیا اس کو بلاؤ لوگوں نے باوجود اس کی تکذیب کے اتمام حجت کے لیے آواز دی شاہ صاحب نکلے اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے لوگوں نے پوچھا کیا ظلم کیا، کہنے لگا میں ان کی تھیلی چھین کر بھاگا تھا تو مجھے راستہ نہیں ملتا، ان سے کہو اپنی تھیلی لے لیں اور وہ تھیلی سامنے رکھ دی کہ یہ لے لو، شاہ صاحب نے کہا میری نہیں ہے میں کیسے لے لوں۔

اب لوگ حیران ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص اتنا روپیہ دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تمہارا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ میرا نہیں، یہ عجیب مقدمہ ہے دنیا میں تو مقدمے اس طرح کے ہوا کرتے ہیں کہ ہر فریق یہ دعویٰ کیا کرتا ہے کہ روپیہ میرا ہے مگر یہاں اس کا عکس (۱) ہے کہ ہر فریق یہ کہتا ہے کہ میرا نہیں۔ محلے والوں نے کبھی دیکھا تھا کہ یہ تھیلی شاہ صاحب کے ہاتھ میں رہا کرتی ہے اس واسطے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ ملک شاہ صاحب ہی کی ہے مگر وہ انکار کرتے ہیں تو وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا بات ہے، کسی نے پوچھا کہ یہ تھیلی تو آپ ہی کی ہے کہا ہاں میری ہی تھی مگر اب نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ جب یہ شخص میرے ہاتھ میں سے اس کو چھین کر بھاگا مجھے خیال ہوا کہ یہ شخص گنہگار ہوا اور اس کے بدلے دوزخ میں جائے گا۔ اس سے مجھے نہایت قلق ہوا کہ ایک مسلمان میرے سبب دوزخ میں جائے۔ لہٰذا میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا کہ اللہ یہ مال میں اس کو ہبہ کرتا ہوں اور بعد ہبہ کے قبضہ بھی (۲) ہو گیا اس لیے اب یہ مال اس کی ملک ہو گیا اور ہبہ میں رجوع (۳) جائز نہیں تو اب میں اس مال کو کیسے واپس لوں۔ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیجئے کہ اگرچہ یہ مال ہبہ کر دیا گیا تب بھی اس صورت میں رد (۴) جائز ہے

(۱) الٹا (۲) ہبہ کے صحیح ہونے کے لیے قبضہ شرط ہے جو پایا گیا (۳) کسی کو کوئی چیز ہبہ کر کے واپس لینا جائز نہیں (۴) واپس کرنا۔

کیونکہ ایجاب سے ہبہ تام نہیں ہوا اور قبول پایا نہیں گیا۔ پھر خاص کر اس صورت میں کہ موہوب لہ رضا مندی سے خود واپس کر رہا ہے تو یہ درحقیقت رجوع ہے ہی نہیں لیکن ان حضرت نے صرف اپنے ایجاب کو مورث (۱) شبہ اور صورت رجوع کو مشابہ رجوع حقیقی کے قرار دے کر اس سے احتیاط فرمائی۔

اہل اللہ کی لطافت

ان حضرات کی طبیعت ایسی لطیف ہوتی ہے کہ عدم جواز کے شبہ کو بھی گوارا نہیں کرتی اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جو ناجائز چیز کے ساتھ کرتے ہوں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو معمولی آدمی ہیں کہ کھانے پینے میں صفائی کا چنداں اہتمام نہیں کرتے اور بعض نفیس مزاج ایسے ہوتے ہیں کہ پانی ان کے سامنے ذرا میلے برتن میں بھی لایا جاوے تو ان کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی حالانکہ پانی میں کچھ میل نہیں ہے مگر برتن کی صورت دیکھ کر ان کی طبیعت پانی سے ہٹ جاتی ہے۔ اسی طرح ان حضرات کا ادراک ہوتا ہے کہ اگرچہ کوئی فعل معصیت (۲) نہ ہو لیکن ذرا سا شبہ اور نام معصیت کا اس میں شامل ہوجانے سے ان کی طبیعت اس سے ہٹ جاتی ہے۔ یہ اس واسطے کہہ دیا گیا کہ اُن پر کوئی ناواقفی احکام غلو فی الدین (۳) کا اعتراض نہ کرے۔ اہل اللہ پر اعتراض نہ کرو ان کی کوئی بات ظاہراً خلاف بھی دیکھو تو جلدی نہ کرو، انتظار کرو ان کو حق تعالیٰ نے فہم سلیم دیا ہے وہ نشیب و فراز کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر صبر کرو ان کے فعل میں ضرور کچھ حکمت نکلے گی۔ یہ حضرات دور تک پہنچتے ہیں۔ دیکھئے ان بزرگ کی نظر کہاں پہنچی کہ اس شخص کی تکلیف کا خیال ہوا کہ یہ دوزخ میں جائے گا اور میری وجہ سے اس کو عذاب ہوگا۔ اس واسطے وہ مال اس کو ہبہ کر دیا۔ کیا ٹھکانا ہے اس باریک بینی کا اور اس رحم کا یہ حضرات اپنے اوپر سخت ہوتے ہیں اور دوسرے کے اوپر

(۱) معاف کرنے کو انہوں نے اپنے ہبہ قرار دیا جس سے شبہ پیدا ہوا کہ ہبہ صحیح ہوگیا اور پھر واپس لینے کو یہ سمجھا کہ یہ تو ہبہ کا واپس لینا ہے۔ اس لیے اس سے رکے (۲) گناہ (۳) دین میں غلو۔

بے حد نرم دوسرے کی ذرا سی تکلیف بھی ان سے دیکھی نہیں جاتی اور اگر کہیں سختی بھی کرتے ہیں تو وہ سختی ان کی واقع میں سختی نہیں ہوتی کیونکہ دوسرے کے نفع کے لیے ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ڈاکٹر پھوڑے کا آپریشن کرتا ہے کہ اس سے مریض کو تکلیف ہوتی ہے اور دیکھنے والے بھی اس کو بے رحمی اور قصائی پنا کہتے ہیں۔ حتی کہ بعض نرم طبیعتیں تو آپریشن کرتے ہوئے دیکھ بھی نہیں سکتیں لیکن درحقیقت یہ بے رحمی نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر جانتا ہے کہ ابھی تو پھوڑا ہے اگر آپریشن نہ کروں گا تو سارا عضو سڑ جائے گا اور سب کو کاٹنا پڑے گا تو وہ اس ذرا سے آپریشن کی بدولت سارے عضو کو کٹنے سے بچاتا ہے تو یہ رحم ہوا یا بے رحمی۔ یہ اگر بے رحمی ہوتی تو مریض کے گھر والے اور ماں باپ اس کو ڈاکٹر کے پاس کیوں لے جاتے اور کیوں فیس دیتے یہ اچھی بے رحمی ہے کہ ہاتھ جوڑتے ہیں اور نخرے اٹھاتے ہیں اور روپیہ خرچ کرتے ہیں اور آپریشن کراتے ہیں۔

ہاں صورت بے رحمی کی ضرور ہے مگر درحقیقت رحم ہی ہے اسی طرح ان حضرات کی سختی ہوتی ہے کہ ظاہراً سختی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت رحم اور ہمدردی ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر آج ایسا نہ کیا جائے گا تو کل کو یہ شخص جہنم میں جائے گا اس واسطے اس تھوڑی سی سختی کو اس کے واسطے پسند کرتے ہیں جس کی بدولت وہ دائمی عذاب سے بچ جاتا ہے اور سچی بات چھپی بھی نہیں رہتی ان کا برتاؤ کسی کے ساتھ کیسا ہی روکھا ہو لیکن تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں نفسانیت نہ تھی بلکہ محض للّٰہیت اور ہمدردی ہی تھی اس واسطے یہ روکھا برتاؤ بھی کسی کو ناگوار نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ اس کے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور ہاتھ جوڑتے ہیں کہ میرے اوپر بھی سختی کیجئے کیونکہ جان جاتے ہیں کہ ان کی سختی بھی نرمی ہے۔ غرض ان حضرات کو اس قدر ہمدردی ہوتی ہے کہ ان بزرگ نے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف اتنے سے خیال پر چھوڑ دی کہ اس بدو کو عذاب ہوگا۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہے۔ یہ ہیں اخلاق حقیقی ایسے لوگ باتیں بنانے والے

اور تیز طرار اور چرب زبان نہیں ہوتے۔ ظاہر میں روکھے اور کم عقل معلوم ہوتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کیسے روکھے ہوتے ہیں کہ ساری عمر کی کمائی ایک بدو کو دیدی اور عاقل اور فہم کیسے کہ کہاں نظر پہنچی ان کو اخلاق کہنا چاہیے۔

آخرت ایک بازار ہے

یا آج کل کی طرح آؤ بھگت کرنے اور بار بار جھکنے اور آداب تسلیمات کو یہ تو اس گاڑی بان کی سی تواضع ہے جس کو گنوار کہا جاتا ہے مگر یہ تعلیم یافتہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اہل اللہ کے حالات کو پڑھئے تو معلوم ہو کہ اخلاق ایسے ہوتے ہیں کہ تیز مزاج بی بی کے ساتھ ساری عمر نباہ دی اور دوسرے کی اس مصیبت کو پسند نہ کیا۔ اور ایک عورت سے پیغام دینے پر نادم ہوئے کہ وہ علم الٰہی میں دوسرے کے لیے تھی اور بازار کی روٹی کھانے کو پسند نہ کیا کہ یہ بہت سے حاجت مندوں کے لیے حسرت کا باعث ہوئی ہے، یہ سب بیان استطراداً آ گیا۔ بیان یہ تھا۔

کہ بازار چندان کہ آگندہ تر(۱)

اور اس سپاہی کی مثال دی گئی تھی جس نے پانچ ہزار روپیہ کمایا اور سب سرائے کی کوٹھڑی کی آرائش میں لگا دیا اور وقت ختم ہونے پر بھٹیاری نے نکال باہر کیا۔ اب یہ بال بچوں کے پاس گئے تو ہاتھ میں کچھ بھی نہیں، بازار میں گئے تو دیکھ دیکھ کر حسرت ہو رہی ہے۔ حسرت پر ایک قصہ چھڑ گیا تھا اس کی مناسبت سے دوسرا اور تیسرا قصہ آ گیا اور بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی مگر خیر کچھ حرج نہیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا، بہت سی کام کی باتیں کانوں میں پڑ گئیں۔ مقصود یہ تھا کہ آخرت ایک بازار ہے اور اس کا سکہ اعمال ہیں۔ اگر یہ سکہ پاس نہ ہوگا تو آدمی کس چیز سے وہاں کی نعمتوں کو خریدے گا ہم کو اس سکہ کے فراہم کر لینے کی پروا نہیں، ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ دنیا کی سرائے میں لگائے چلے جاتے ہیں تو ہماری حالت اسی مسافر کی سی ہے جس نے ساری کمائی سرائے کی

(۱) ''بازار جس طرح بھرتا اور پُررونق نظر آتا ہے تہی دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوتا ہے''۔

کوٹھڑی میں لگادی اور گھر گئے تو کچھ بھی نہ تھا، خوب سمجھ لو کہ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے بلکہ سرائے ہے اس میں اس سے زیادہ نہ لگاؤ جتنا تمہارے ایک رات کے بسر کرنے کے لیے کافی ہو ہمارا گھر وہ ہے جو دارالسلام ہے وہاں کے واسطے کچھ جمع کرلو، دنیا تو بہت ناقص گھر ہے یہ گھر راحت کے لیے بنایا ہی نہیں گیا، آخرت البتہ کامل گھر ہے اور راحت کا گھر اور دارالسلام ہے اس کو حق تعالیٰ جیسے علیم وقدیر نے امن وسلامت عن الآفات (۱) کے لیے بنایا ہے اس میں کوئی بھی آفت عادی اور غیر عادی اور موجودہ اور مفروضہ کوئی بھی نہیں ہوسکتی حق تعالیٰ کو اس کے موضوع (۲) کا علم بھی محیط وکامل ہے اور اس کو مع تمام متعلقات کے موجود کردینے پر قدرت بھی کامل ہے پھر اس کو دارالسلام فرمایا ہے تو اس میں بتلادیا کہ وہ گھر سلامت عن الآفات کے لیے کامل مکمل گھر ہے۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں لھم دار السلام عندربھم (۳) یہاں تک کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ جنت امن وامان کا کامل گھر ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ میں بیان کرچکا ہوں کہ یہ ثمرہ ہے اعمال کا، بنا اس ثمرہ کی اعمال پر ہے تو جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی ثمرہ ہوگا۔ چنانچہ کل میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کے مراتب ہیں کیونکہ اسلام نام ہے مجموعہ اعمال صالحہ کا اور اعمال ہی سے اس کا کمال ہوتا ہے اور اعمال میں مراتب ہیں تو اسلام میں بھی مراتب ہوئے۔

ترغیب حصول اسلام کامل

پس جیسا اسلام ہوگا ویسا ہی ثمرہ ہوگا، اسلام کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا اور ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ پس اسلام اور اعمال کی تکمیل کا اہتمام کروتا کہ ثمرہ کامل میسر ہو اب ثمرہ کے کامل ہونے کا بیان سمجھئے۔ ثمرہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اولاً اور لاعذاب ملے یعنی قیامت کے دن ابتداء بخشش ہوجائے اور زرا بھی عذاب نہ اٹھانا

(۱) راحت وآرام اور آفات سے محفوظ رکھنے کے لیے بنایا ہے (۲) اس میں کسی قسم کی آفت نہیں ہے نہ عادۃً نہ فرض کردہ اللہ تعالیٰ کو اس کے بنانے کا علم مکمل حاصل ہے کہ کسی غرض سے بنائی گئی ہے اور اس کے لیے تمام سامان راحت پیدا کرنے پر بھی قدرت کامل ہے (۳) ''ان کے رب کے پاس ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے''

پڑے یہ ثمرہ سلام کامل ہی پر مترتب ہوگا اور اگر اسلام ناقص ہے تب بھی نفس ثمرہ تو مترتب ہوگا۔ کیونکہ اسلام تو ہے ہی مگر نقصان کے ساتھ وہ نقصان یہ ہے کہ چند روز دوزخ میں جھلس کر جنت ملے گی اور ایک نقصان ثمرہ کا یہ بھی ہوگا کہ گو جنت ابتداء مل جائے لیکن اگر اعمال اعلیٰ درجہ کے نہیں تو وہ مرتبہ جنت میں نہیں ملے گا جو اعلیٰ درجہ کے اعمال پر ملتا یہ بھی ایک نقصان ہے مگر اس پر مت بیٹھ رہنا کہ چند روز دوزخ ہی میں رہ کر جنت مل جاوے گی یا گھٹیا درجہ ہی مل جائے گا۔ اعلیٰ درجہ کا حوصلہ کیوں نہ کرو دنیا میں کوئی اس پر قناعت نہیں کرتا کہ آدھی روٹی کھا کر بیٹھ رہے، دنیا میں تو پیٹ سے بھی زیادہ کھانا چاہتے ہیں۔ خصوصًا پرائے گھر میں چنانچہ عادت ہے کہ باہر کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے اور یہ کوئی برا بھی نہیں ہے۔ یہ حرص میں داخل نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گھر تو روزمرہ کھاتے ہی ہیں دونوں وقت کا یہ مشغلہ ہے تو کھانا کھانا گھر پر کوئی نیا کام نہیں ہے اور جو کام روزمرہ کا ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہتی اور اگر اس میں کوئی نیا رنگ آجاتا ہے تو اس میں دل لگتا ہے۔ اسی کی ایک فرع ہے باہر کا کھانا کہ فی الجملہ نئی سی بات ہے اس واسطے طبیعت کو اس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے نیز یہ بھی ہے کہ اپنے گھر میں کھانا پکتے ہوئے دیکھنے سے بھی طبیعت بھر جاتی ہے اس واسطے بھی کم کھایا جاتا ہے۔

عورتوں کی میراث ہڑپ کرنے کا انوکھا طریقہ

اسی پر بعض مذاہب کے فقہاء نے ایک مسئلہ کو مبنی کیا ہے مگر اس کے قبل ایک قاعدہ سمجھ لیجئے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی چیز کسی سے چھین لی اور پھر کسی طرح واپس کردی۔ اس صورت سے کہ مالک کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ یہ چیز اصل میں میری تھی تب بھی یہ رد صحیح ہوگیا اور اس کا ذمہ اس مغصوب (۱) سے بری ہوگیا گناہ نہیں رہا۔ البتہ اس کے رد صحیح ہونے (۲) میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ چیز بجنسہ (۳) واپس کی ہو نہ ایسا جیسے

(۱) جس نے وہ چیز غصب کی تھی اس سے بری ہوگیا (۲) اس واپسی کے درست ہونے کے لیے یہ شرط ہے (۳) اپنی اصلی حالت میں۔

کہ آج کل لوگ بہنوں کا حصہ غصب کرتے ہیں کہ میراث میں سے ان کا حصہ نہیں دیتے اور اس کو ادا اس طرح کرتے ہیں کہ بھات (۱) میں اور دیگر رسوم میں روپیہ لگا دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ان کا حق ادا ہو گیا اتنا ہم نے لیا بھی نہیں تھا جتنا ان کو لگا دیا اس سے ان کا حق ادا نہیں ہوا اور رسم کی بدعت علیحدہ رہی۔ خدا جانے اس سے کیا نفع ہے کہ خرچ اتنا ہی ہو جاتا ہے مگر بے قاعدہ اور شریعت کے خلاف۔ اگر یہی خرچ قاعدہ کے موافق ہوتا تو حق بھی ادا ہو جاتا اور کوئی گناہ بھی نہ ہوتا۔ اب اسے جس طرح خرچ کیا ہے اس سے نفع تو کچھ بھی نہیں اور گناہ مفت میں کمایا۔

آج کل رسوم کی حالت

اور رسوم کی یہی حالت ہے کہ دنیا کا بھی نقصان کیونکہ خرچ بہت ہوتا ہے اور آخرت کا بھی نقصان کیونکہ گناہ ہوتا ہے اور کیسی کیسی بیہودہ رسمیں ہیں بھات، چھوچھک، چوتھی چالا (۲)، ان کے ناموں ہی سے وحشت ہوتی ہے اور نام بتلا رہے ہیں کہ ہنود کی رسم ہے۔ غرض جو لاگت بھات میں لگائی گئی اس سے وہ مغصوب (۳) ادا نہیں ہوا کیونکہ وہ چیز بجنسہ واپس نہیں کی گئی (ہنس کر فرمایا واجب تو گیہوں اور روپیہ تھا اور دیا گیا بھات) غرض یہ ادا نہیں ہوا۔ البتہ اگر اطلاع کر کے اجازت لے لی جاوے یعنی صاحب حق سے یوں کہا جائے کہ تمہارے اتنا روپیہ یا فلاں چیز میراث میں ہماری ذمہ ہے اس کی جگہ اگر تم منظور کرو تو ہم یہ چیزیں جو بھات میں دی جاتی ہیں دے دیں اگر وہ بخوشی منظور کرے تو حق ادا ہو جائے گا لیکن اس میں بھی شرط یہ ہے کہ یہ اطلاع تنہائی میں کی جائے یہ نہیں کہ مجمع میں۔ اس سے کہا جائے کے شرما حضوری اس کو مان لیں۔ غرض اس طرح سے اجازت لی جائے کہ بالکل طیب خاطر (۳) سے اور بلا لحاظ کسی کے وہ مان لے

(۱) جہیز وغیرہ کی رسوم میں (۲) ابلے ہوئے چاولوں یا وہ سامان جو بطور امداد بھائی کی طرف سے بہن کو دیا جائے بھات کہلاتا ہے۔ زچہ خانے کی رسم جو بچہ پیدا ہونے کے چھٹے روز لڑکی کو ماں اور بھائیوں کی طرف سے کچھ دیا جائے چھوچھک کہلاتا ہے۔ چوتھی ایک قسم کا سوتی کپڑا ہے جس کو چار تہہ کر کے بچھاتے ہیں۔ چالا نئی دلہن کا شادی کے بعد سسرال سے چار مرتبہ میکے جانا (۳) جو وراثت غصب کی وہ ادا نہیں ہوئی (۴) خوش دلی۔

حتیٰ کہ اگر نقد روپیہ بھی اس کے سامنے رکھ دیں تب بھی چیز کو نقد پر ترجیح دے۔ تب یہ اجازت معتبر ہے ورنہ بلاطیب خاطر اجازت معتبر نہیں۔

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا اب وہ مسئلہ سنئے کہ اگر کسی نے کھانا کسی سے غصب کرلیا اور بلا اطلاع اس طرح واپس کر دیا کہ اسی کو کھلا دیا تو بعض آئمہ کے نزدیک یہ ادا نہیں ہوا کیونکہ ممکن ہے کہ اگر اس کو معلوم ہوجاتا کہ یہ میرا کھانا ہے تو کم کھاتا اور کچھ بچالیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عادت عامہ یہی ہے کہ آدمی اپنا کھانا کم کھاتا ہے اور دوسرے کے گھر زیادہ کھاتا ہے۔ مگر ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ ایسے حبشیوں کی عادت کا اعتبار نہیں جو دوسرے کے گھر خواہ مخواہ زیادہ کھاجاتے ہیں اس لیے یہ غصب ادا ہوجاوے گا میں ان دونوں قولوں میں تطبیق دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں اکثر لوگ حریص نہ تھے اور اپنے گھر اور دوسرے کے گھر میں چنداں فرق نہ کرتے تھے لہٰذا اس وقت کے مناسب یہ فتویٰ تھا کہ اس صورت میں غصب ادا ہوگیا اور اب لوگ حریص ہیں اپنے گھر میں اور پرائے گھر میں ضرور فرق کرتے ہیں کہ دوسرے کا کھانا ضرور زیادہ کھائیں گے اور اپنا کھانا کم خرچ کریں گے اور بچائیں گے۔ لہٰذا آج کل فتویٰ اگر یہی ہو کہ اس کا کھانا اسی کو کھلا دینے سے غصب ادا نہ ہوگا تو گنجائش ہے کیونکہ اس کا نقصان ہوا اگر اس کو معلوم ہوجاتا کہ یہ میرا کھانا ہے تو ضرور اس میں سے کچھ بچاتا۔

جوتیوں کا صدقہ

اس پرائے کھانے پر ایک قصہ یاد آ گیا کسی شخص کو اس کے دوستوں نے تنگ کیا کہ ہماری دعوت کر جب اس کا کوئی عذر نہ سنا گیا اس نے منظور کیا مگر یہ کہا کہ دعوت میں عمدہ پوشاک اور عمدہ جوتے پہن کر آنا جب سب جمع ہوگئے اس نے کیا کیا کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر حلوائی کے یہاں گروی رکھ دیں اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں لاکر سامنے رکھ دیں اور سب نے مل کر مفت کا مال سمجھ کر خوب مزے سے کھائیں اور تعریف کرتے جاتے تھے کہ بڑی نفیس مٹھائی کھلائی وہ جواب میں کہتا حضرت آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے

مہمان سمجھے کہ یہ تواضعاً کہہ رہا ہے۔ جیسا کہا کرتے ہیں کہ سب آپ ہی کا ہے کہ اس کے معنی حقیقی مراد نہیں ہوا کرتے بلکہ اپنے مال کو مخاطب کی طرف تواضعاً منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ جب مہمان وہاں سے اٹھے تو دیکھا جوتیاں ندارد، کہنے لگے خدا جانے جوتیاں کیا ہوئیں کہا حضرت میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ حضور ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ اب وہ سمجھے کہ یہ بالفظ تواضعاً نہ تھا بلکہ معنی حقیقی پر محمول تھا۔ اب مزہ معلوم ہوا اچھے اچھے کھانوں کا یہ چند مضامین اس لفظ پر ضمناً آ گئے تھے کہ خصوصاً پرائے گھر میں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ دنیا میں جب ادنیٰ ثمرہ پر اکتفا نہیں کرتے تو وہاں کے ثمرات کے درجہ کامل کو کیوں نہیں طلب کرتے اور یہاں تو معطی کا کرم محدود ہوتا اس لیے بعض اوقات زیادہ طلبی ناگوار ہونے لگتی ہے اور وہاں تو معطی وہ ذات ہے جس کا کرم غیر محدود ہے، کماً بھی کہ جتنا زیادہ لوخوش ہوتے ہیں اور کیفاً بھی چنانچہ ایک کرم یہ بھی ہے کہ جہاں ثمرات کا وعدہ کیا ہے وہاں یہ بھی کہتے ہیں۔

اعمال کا صلہ

جزاء بما کانوا یعملون (۱) اور ان ھذا کان لکم جزاء (۲) تا کہ بندہ شرمندہ نہ ہو۔ چنانچہ خود اس آیت میں بھی ہے جس کا بیان ہو رہا ہے۔ وھو ولیھم بما کانوا یعملون (۳) اور جا بجا اسی قسم کے حالات آئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آخرت میں جو کچھ درجات اور نعمتیں ملیں گی وہ سب مومنین کے اعمال کا صلہ ہے یہ غایت کرم ہے کہ خود نعمتیں دیتے ہیں لیکن احسان جتلانا نہیں چاہتے ایسے موقع پر بھی کوئی چوک (۴) جائے تو بڑا ہی کم قسمت ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسی جگہ تو لوٹ مچانی چاہیے قناعت چہ معنی؟ (۵) دنیا دار العمل ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ثمرات کی سندیں ایک جگہ تیار کر کے رکھ دی ہیں اور اذن عام (۶) دیدیا ہے کہ جتنے چاہو لو اور ثمرات بے تعداد لوٹ لو پھر حیرت ہے کہ آدمی کیوں نہ لے کیوں بڑھ کر ہاتھ نہ مارے اور کیوں کامل درجہ کی کوشش

(۱) ''بدلہ ہے جو وہ عمل کرتے تھے'' (۲) ''یہ تمہارے لیے بدلہ انعام ہے'' (۳) ''اور وہ ان سے محبت رکھتے ہیں ان کے اعمال کے سبب (۴) وہ انعام حاصل نہ کرے (۵) قناعت کا کیا مطلب (۶) عام اجازت دے دی۔

نہ کرے ادنی درجہ پر بس کر کے کیوں بیٹھ رہے یا اتنی ہمت کیوں ہارے کہ کچھ عذاب ہی بھگت کر جنت مل رہے گی کامل درجہ کیوں نہ حاصل کرے کہ جنت ابتدا اور بلا عذاب ملے۔ یہ بیان ہوالھم دار السلام (۱) کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس کے معنی ہیں کامل سلامتی کا گھر۔ لفظ دارالسلام ہی اس کمال پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ اول تو سلام مطلق ہے اور مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پھر دار کے لفظ کو اس کی طرف مضاف کیا گیا ہے جو محاورہ کے اعتبار سے اس معنی کو مفید ہے اور مراد اس سے جنت ہے جس کو حق تعالیٰ نے کامل امن کا گھر بنایا ہے وہاں خوف وخطر کا نام بھی نہیں۔ آگے عند ربھم (ان کے پروردگار کے یہاں) کو سمجھے اس کے معنی ہیں ان کے رب کے پاس مراد اس سے فی الآخرۃ تو معنی یہ ہوئے کہ ان کو دارالسلام ملے گا۔ آخر میں اس کو میں بیان کروں گا کہ عندربھم (۲) سے مراد دار آخرت کیسے ہوا کیونکہ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ ان کے خدا کے پاس بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے کے لیے قرآن کے محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے میں نے جس بناء پر اس کا ترجمہ دار آخرت کیا ہے آگے بیان کروں گا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عندربھم (۳) کا اطلاق متعدد معانی پر آتا ہے چنانچہ ایک معنی اور بھی ہیں۔

آیت افک پر ایک اشکال کا جواب

چونکہ اس کی تحقیق اہل علم کے سمجھنے کے قابل ہے اس لیے اس کو بھی بیان کرتا ہوں اس معنی میں عنداس آیت میں ہے فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ (۴) یہ آیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے افک کے قصہ میں ہے۔ قصہ طویل ہے اس کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں جتنا جز واس قصہ کا یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان کی برأت حق تعالیٰ نے قرآن میں اتاری اور منافقین کے بکواس کو ردکیا۔ اس رد میں یہ آیت بھی ہے۔ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ گواہ نہیں لا سکے لہٰذا یہ خدائے تعالیٰ کے

(۱) ''ان کے لیے سلامتی کا گھر'' (۲) ''ان کے پروردگار کے یہاں'' (۳) ''ان کے پروردگار کے یہاں''
(۴) سورۂ نور: ۱۳

نزدیک جھوٹے ہیں اس کا مدلول یہ ہوا کہ ان کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ چار گواہ نہ لاسکے۔ اب یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کذب کس کو کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کذب کے معنی حکایت خلاف واقع کے ہیں یعنی ایک کام واقع میں نہیں ہوا اور بیان کیا، کہ ہوا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شہادت نہ لاسکنا مستلزم کذب (۱) ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کسی کو حرام کرتے دیکھا اور اس کی حکایت بیان کی مگر گواہ نہ لاسکا تو اس آیت کی بموجب تو وہ کاذب ہے لیکن یہ حکایت مطابق واقع کے ہے اس پر تعریف کذب کی صادق نہیں آتی اور آیت اس کو کاذب کہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ آیت میں عنداللہ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اور بلفظ دیگر حق تعالیٰ کے علم میں اور یہ مقدمہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے ورنہ علم صحیح نہ ہوگا تو عنداللہ کے مفہوم پر آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص جس نے حرام کو دیکھ کر حکایت بیان کی واقع میں بھی جھوٹا ہے یعنی اس نے واقع میں حرام نہیں کیا کیونکہ علم الٰہی میں اس کو کاذب قرار دیا گیا ہے اور علم الٰہی مطابق واقع کے ہوتا ہے تو اب یہ لازم آتا ہے کہ (نعوذ باللہ) علم الٰہی خلاف واقع ہے۔ یہ ایک سخت اشکال ہے قرآن پر مگر الحمدللہ حق تعالیٰ نے اس کا بہت سہل جواب دل میں ڈال دیا جس کو سننے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ اشکال کچھ بھی نہ تھا۔ اس کی بناء اسی پر ہے کہ قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجمے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے۔ ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کردی جائے تو بالکل اطمینان ہوجاتا ہے اور سننے والا پھڑک اُٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہوجاتے ہیں۔ وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عنداللہ کے معنی یہاں ''فی علم اللّٰہ'' (اللہ کے علم میں) کے نہیں ہیں بلکہ ''فی قانون اللّٰہ''(۲) کے اور فی دین اللہ کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی، تہمت لگانے والوں کے لیے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان

(۱) شہادت پیش نہ کرنے سے کذب یعنی جھوٹ لازم آتا ہے (۲) اللہ کے قانون یا اللہ کے دین میں ہیں۔

کے ساتھ کاذب کا سا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ اشکال تو یہی تھا کہ علم الٰہی کا خلاف واقع ہونا لازم آتا ہے اور یہاں علم الٰہی مراد ہی نہیں صرف یہ معنی ہوگئے کہ قانون ان کو جھوٹا کہے گا، قانون ایک ایسی چیز ہے جس میں ضابطہ دیکھا جاتا ہے جس کے کچھ قواعد مقرر ہوتے ہیں کہ جب تک ان کے موافق کام نہ ہو اس کو معتبر نہیں مانا جاتا۔

قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت

چنانچہ تمام زمانہ کے عقلاء کا قانون ہے کہ کوئی بات بے ثبوت نہیں مانی جاتی خواہ واقع میں وہ بات بالکل صحیح ہی ہو اگر یہ قانون نہ ہو تو دنیا کا نظام ہی بگڑ جائے۔ ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کردے کہ اس نے میرا مال چرایا ہے۔ بس قاضی کو چاہیے کہ اس پر چوری کا جرم قائم کردے اور سزا دے دے۔ دوسرا دعویٰ کردے کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے بس قاضی فوراً اس کو قصاص میں مار ڈالے تو اس طرح تو ایک دن میں دنیا تہ وبالا ہو جائے، دنیا کا نظام قانون قواعد کی پابندی ہی سے رہ سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک شخص پر چار آدمیوں نے زنا کی شہادت دی اور یہاں تک کہا کہ ہم نے مرد اور عورت دونوں کو ننگے اور اوپر نیچے دیکھا مگر یہ نہیں کہا کہ دخول ہوتے دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور مدعا علیہ پر زنا کو ثابت نہیں کیا بلکہ ان گواہوں کو جھوٹا قرار دیا اور ان پر حد قذف جاری کی۔ اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ضابطہ پورا نہ ہوا اور شہادت کی جو شرائط تھی ایک جزو اس کا رہ گیا وہ یہ ہے کہ کالمیل فی المکحلہ(۱) دیکھا ہو حالانکہ ظاہر تو یہی ہے کہ جب مرد اور عورت ننگے ہو چکے تھے تو زنا بھی ضرور واقع ہوا جب ایسا موقع تھا کہ ننگے ہو سکے تو زنا سے کون مانع موجود تھا۔ یہ بات بظاہر قریب یقین ہی کی تھی لیکن اس پر بھی جب کہ آنکھ سے دخول ہوتے نہ دیکھا، گواہوں کے لیے زبان سے ان

(۱) جیسے سرمہ دانی سلائی۔

دونوں کو زانی کہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ چاروں گواہوں پر حد قذف لگائی گئی، آج کل لوگ صرف وہم وگمان پر حکم لگادیتے ہیں اور جو سمجھ میں آتا ہے کسی کی نسبت خیال پختہ کر لیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہ بلا علماء اور مشائخ کے یہاں بہت ہے آج کل حضرت عمر ہوتے تو بکثرت علماء اور مشائخ کے درے لگتے، سب کی کرکری ہوجاتی اور یہ جو بڑے بڑے جبوں اور قلوں میں عیب چھپائے بیٹھے ہیں سب کی حقیقت کھل جاتی۔

بدگمانی میں احتیاط

اس بات میں بڑی احتیاط چاہیے کہ دوسرے کہ نسبت کوئی برا خیال قائم کیا جائے اور زیادہ اہتمام کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ عادت اور طبعی بات ہے کہ اپنی طرف برا گمان کم ہوتا ہے اور دوسرے کی طرف اچھا گمان کم ہوجاتا ہے اکثر کوئی شخص جب اپنی طرف دیکھتا ہے تو نظر اپنے ہنروں اور محامد ہی پر پڑتی ہے اور جب دوسرے کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے عیبوں اور برائیوں پر ہی پڑتی ہے۔ جب یہ طبعی بات ہے تو ان دونوں میں غلطی ہوجانے کا بہت قوی احتمال ہے۔ لہٰذا سخت اہتمام کی ضرورت ہے کوشش کر کے صحیح طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ اپنے ہنروں کو کبھی نہ دیکھے صرف عیبوں ہی کو دیکھے اور دوسرے کے عیبوں کو کبھی نہ دیکھے صرف ہنروں ہی کو دیکھے بتکلف اس کی نگاہ داشت بہت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کرنے سے کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ آدمی کی اصلاح ہوجاوے۔ غرض بے ثبوت بات کہنے سے گناہ بھی ہوگا اور قانون شرعی تا وقت کہ کافی ثبوت باقاعدہ نہ ہو اس کو جھوٹا ہی کہے گا خواہ وہ بات واقع میں جھوٹی نہ بھی ہو یہ معنی ہیں عند اللہ کے یعنی فی قانون اللہ تو آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ تہمت لگانے والے چونکہ اپنے دعویٰ پر باقاعدہ شہادت نہ لاسکے۔ لہٰذا وہ قانون الٰہی میں جھوٹے کہے جاویں گے اور کذب کے احکام ان پر جاری ہوں گے۔ چنانچہ تین صحابہ کو جو بھولے پن سے اس قصہ میں شریک ہوگئے تھے حد قذف لگائی گئی اور منافقین چونکہ چالاکی سے اس شرارت میں حصہ لے رہے تھے بقول مشہور ثبوت نہ ہونے سے دنیا میں حد سے بچ گئے اور

آخرت میں تو مزہ چکھیں گے۔ غرض اس تقریر کے بعد آیت پر کوئی اشکال نہیں رہا۔

فقہ کا ایک ضابطہ

اور فقہ کے بہت سے احکام کا یہی مبنی ہے کہ بسا اوقات ضابطہ کے درجہ میں ایک حکم کو ثابت مانا جاتا ہے خواہ واقع میں کچھ بھی ہو۔ مثلاً دو عادل آدمی گواہی دیں کہ ہم نے ۲۹ کو چاند دیکھا ہے تو اب رمضان یا عید کو ثابت مانا جاوے گا۔ اگرچہ انہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو۔

لعان اور اس کا حکم

اسی طرح بسا اوقات ایک حکم منفی مانا جاتا ہے خواہ واقع میں ثابت ہی ہو۔ مثلاً ایک شخص کا ایک بچہ ہونے پر تہمت لگانے سے لعان ہوا تو اس بچہ کے نسب کی اس شخص سے نفی کی جاوے گی۔ خواہ واقع میں اسی کا ہو اس کی صدہا نظیریں موجود ہیں تمام کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں لیکن اس کا علاج کیا جائے۔ بہشتی زیور میں کوئی ایسا مسئلہ لکھ دینا جرم قرار پاوے اور وہی مسئلہ اور اس کی صدہا نظیریں عربی کی کتابوں میں لکھی ہوں بلکہ ان کے اردو ترجمے میں بھی لکھے ہوں تو جرم نہیں۔ مثلاً بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ کسی عورت کے بچہ ہوا اور خاوند اس کا مدت سے غائب ہے تو اس بچہ کو ولد حرام نہ کہا جائے گا اس مسئلہ پر بڑا پر غل مچا ہے اور لوگوں کو بڑے بڑے اشکال ہوئے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بہشتی زیور میں کسی نے اپنی طرف سے اس کو لکھ دیا ہے یا فقہ کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ کتاب کو تو دیکھ لینا چاہیے تھا اور کتاب کو بھی نہ دیکھا جاوے تو یہ مسئلہ کوئی چھپا ہوا مسئلہ نہیں ہے مبتدی طالب علم بھی اس سے واقف ہیں۔ غرض یہ کہ بہشتی زیور میں اختراع (۱) کر کے یہ مسئلہ نہیں لکھا گیا بلکہ فقہ کی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

تعجب ان لوگوں سے ہے جو فقہ کو تسلیم کرتے ہیں اور بہشتی زیور پر اعتراض کرتے ہیں اور اسی فقہ کی کتاب کے ترجمہ پر اعتراض نہیں کرتے جس میں یہ مسئلہ لکھا

(۱) گھڑ کر۔

ہے۔ سو بہشتی زیور پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے اگر اعتراض کرنا ہے تو فقہ پر کرو فقہ میں صاف لکھا ہے کہ اس صورت میں وہ بچہ ولد حرام نہیں کہا جائے گا جب تک کہ خاوند انکار نہ کرے کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے اور صرف انکار ہی نہیں بلکہ لعان ہوگا۔

لعان کا طریقہ

باقاعدہ اس طرح کہ قاضی کے سامنے مقدمہ جائے گا، مرد اور عورت دونوں حاضر ہوں گے۔ مرد اس بچہ کے نسب سے انکار کرتا ہے مگر انکار کر کے چھوٹ نہیں جائے گا کیونکہ یہ انکار مستلزم (۱) ہے عورت کو حرام کار کہنے کو، یعنی زنا کی تہمت لگانے کو اور بچہ کو مجہول النسب کر دینے کو اس کو شریعت نے کوئی معمولی بات نہیں قرار دیا کیونکہ تمام عمر کے لیے ایک عورت بے آبرو ہوتی ہے اور ایک بچہ مجہول النسب (۲) بنتا ہے۔ لہٰذا اس مرد سے چار دفعہ قسم لی جائے گی کہ خدا کی قسم میں اپنے اس دعویٰ زنا میں سچا ہوں اور اتنے پر بھی بس نہیں۔ پانچویں دفعہ یوں کہلایا جائے کہ میرے اوپر لعنت ہو خدا کی اگر میں جھوٹا ہوں۔ دیکھئے کس قدر سخت بات ہے کسی کے نسب میں طعن کرنا خیر یہ تو اس مرد کو قسمیں دی گئیں ابھی لعان ختم نہیں ہوا۔ اب عورت سے کہا جائے گا کہ چار دفعہ اس طرح قسم کھاوے کہ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یوں کہلایا جائے گا کہ خدا کا غضب ہو میرے اوپر اگر یہ سچا ہو۔

یہاں ایک نکتہ بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مرد سے تو یوں کہلایا گیا کہ لعنت ہو خدا کی میرے اوپر اگر میں جھوٹا ہوں اور عورت سے یوں کہلایا گیا کہ غضب ہو خدا کا، وہاں لعنت کا لفظ اور یہاں غضب کا اس کی کیا وجہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی زبان پر لعنت کا لفظ تو کثرت سے چڑھا رہتا ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے زیادہ تر دوزخ میں عورتوں کو دیکھا اور اس کی وجہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا (وتکثرن اللعن) (۳) یعنی تمہاری یعنی عورتوں کی عادت ہے کہ لعنت

(۱) اس انکار سے عورت کو حرام کار کہنا لازم آتا ہے جو زنا کی تہمت ہے (۲) اس کا نسب معلوم نہیں (۳) الصحیح للبخاری ۱: ۸۳، الصحیح للمسلم الایمان: ۱۳۲

بہت کرتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت کا لفظ ان کی زبان پر عادتاً بہت چڑھ ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کثرت سے عورتوں کی زبان پر یہ الفاظ رہتے ہیں خدا کی مار، خدا کی پھٹکار وہی لعنت کا ترجمہ اس لیے لعان کے موقع پر اگر ان سے لعنت کا لفظ کہلا جائے تو طبیعت ان کی کچھ ایسی نہ رُکے گی۔ لہٰذا بجائے لعنت کے غضب کے لفظ کو اختیار کیا گیا۔ واقعی قرآن ایسے متکلم کا کلام ہے کہ اس کو رگ رگ پرزہ پرزہ معلوم ہے۔ اس کو لعان کہتے ہیں اس کے بعد قاضی کہے گا ''فرقت بینکما'' یعنی میں نے تم دونوں کو الگ کر دیا اور یہ بچہ اس مرد کا نہیں اب اس کا نکاح اور بچہ کا نسب زائل ہو گیا اور مان لیا جائے گا کہ یہ بچہ اس خاوند کا نہیں ہے اور پھر بھی اس سارے جھگڑوں اور قصوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ بچہ کا نسب اس سے قانوناً ثابت نہ رہا اور میراث وغیرہ کے احکام جاری نہ ہوں گے اس کے سوا کوئی اثر نہیں۔ حتیٰ کہ اب بھی یہ کسی کو عمر بھر جائز نہیں کہ اس عورت کو بدکار یا اس بچہ کو ولد الحرام کہے۔

کسی عورت پر تہمت لگانا سخت کبیرہ گناہ ہے

اور کتابوں میں وہ احتمالات بھی لکھے ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے کہ عورت بدکار نہ ہو اور بچہ ہو جائے۔ مثلاً یہ صورت ہوئی ہو کہ سوتی عورت سے کسی غیر شخص نے جماع کیا اور حمل ہو گیا تو اس وقت میں خاوند بھی سچا ہے کہ اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور عورت بھی بے قصور ہے کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ گو اس قسم کے احتمالات بعید ہیں مگر امکان کے درجہ میں ضرور ہیں۔ احتیاط کے موقع پر ان کا لحاظ کیا جاسکتا ہے کسی عورت کو تہمت لگانا کوئی معمول گناہ نہیں بلکہ بڑا کبیرہ ہے اس میں حد درجہ کی احتیاط کرنا ضروری ہے۔ شریعت نے اس بارے میں نہایت درجہ احتیاط کی ہے اور اگر اس صورت میں بھی جبکہ خاوند نے بچہ کے نسب سے انکار کیا ہے اور اس سے لعان کو کہا گیا اور اس نے منظور نہ کیا تو باوجود انکار کے بھی بچہ اسی کا کہا جاوے گا اور قاضی اس انکار کو نہیں مانے گا اور بچہ کو مجہول النسب نہیں کہے گا اور تمام احکام نسب کے، جیسے میراث وغیرہ سب کو جاری کرے گا۔ غرض جب تک لعان نہ ہو اس وقت نسب ثابت رہے گا خواہ خاوند حاضر ہو

اور نسب کی نفی کرے اور خواہ غائب ہو ہر حالت میں نسب ثابت ہوگا اور ثابت ہونے کے معنی وہی ہوں گے جو اوپر معروض ہوئے کہ قانوناً ثابت ہوگا مگر لوگوں کے ایسے مذاق بگڑے ہیں کہ یہ مسئلہ سن کر ہی فوراً بے سمجھے اعتراض کر دیتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مرد دس برس سے باہر ہو اور پھر بھی یہ بچہ اس کا کہا جائے اس اعتراض کی وجہ درحقیقت تو یہ ہے کہ دلوں میں خوف خدا اور دین سے مس(۱) اور احکام شرعی کی پرواہ نہیں ہے۔ زبان سے جو چاہا کہہ دیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ شریعت نے اس بارے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فراش(۲) کے ہوتے ہوئے نسب کو دوسری طرف نہیں لے جاسکتے یعنی جب تک کہ میاں بی بی کا تعلق موجود ہے نسب کو ثابت ہی کہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خاوند دو برس سے باہر ہے یہاں اس سے بچہ کیسے ہوگیا یہ بعید بیشک ہے مگر اُدھر گناہ جو موجود ہے کسی عورت کو حرام کار کہنا اور کسی آدمی کو مجہول النسب کر دینا سخت کبیرہ ہے اس کے حرام کار ہونے کا ثبوت کوئی کہاں سے لائے گا۔ اس واسطے بعید سے بعید صورت بھی ایسے موقعہ پر مان لی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی بعض صورتیں جو ممکن ہیں کتابوں میں لکھی ہیں مثلاً استخدام جن(۳) سے ایسا ہوسکتا یعنی کسی کے جن تابع ہو اس نے عورت کو وہاں پہنچادیا یا مرد کو یہاں لے آیا یا یہ کہ جن نے بوجہ عداوت ایسا کیا کہ بدنام کرنے کو عورت کو مرد کے پاس پہنچادیا یا مرد کو عورت کے پاس پہنچادیا اور حمل ہوگیا اور بچہ ہوا، جنوں کا وجود ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح عداوت بغض وغیرہ اخلاق رذیلہ رکھتے ہیں تو اگر کسی جن کو کسی عورت سے عداوت ہو اور وہ ایسا کر گزرے اس غرض سے کہ عورت بدنام ہوجائے تو کیا عجب ہے یہ صورتیں بعید اور بہت بعید سہی مگر امکان کے درجہ میں ضرور ہیں۔ پھر جب ایک صورت ممکن ہے تو کس طرح کسی کو تہمت لگائی جائے۔ یہ حیلے بھی میں نے نہیں تراشے بلکہ انہی کتابوں میں لکھے ہیں جن سے بہشتی زیور ماخوذ ہے اور جو معترض کے نزدیک بھی مسلم ہیں سو جو کچھ اعتراض کرنا ہو ان کتابوں پر کیجئے اور جو کچھ تعجب ہو وہ ان کتابوں پر

(۱) تعلق (۲) شوہر کے ہوتے ہوئے (۳) کسی نے جن تابع کرلیا اور اس کے ذریعہ اپنی بیوی کو اپنے پاس بلالیا۔

ہونا چاہیے، نقل کرنے والا کسی بات کا ذمہ دار نہیں اور کسی اعتراض کا دفع کرنا اس کے ذمہ نہیں۔

صحیح النسب ہونے کے لیے وجود نکاح کافی ہے

غرض کتب فقہ سے اور ادلہ شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ اس صورت میں کہ مرد دس برس سے باہر ہے اور اس کی عورت کے بچہ پیدا ہوا تو یہ مجہول النسب نہیں ہے بلکہ اس کا نسب اسی شخص سے مانا جاوے گا اور تمام احکام نسب کے جاری ہوں گے۔ اس حکم میں تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ کیسا حکم ہے سو اس تعجب کا رفع کرنا گو کسی طرح ہمارے ذمہ نہیں مگر میں تبرعاً اس کو بھی حل کر رہا ہوں کہ اس کہنے کا کہ یہ بچہ اس خاوند کا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقت میں اس کا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ قانون میں اس کا ہے اب سارے اشکال اور تعجب رفع ہو گئے اور نسب جب ثابت ہوگا اس کا ثبوت قانونی ہی ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی بناء بالکل ایک خفی (۱) امر یعنی جماع پر ہے۔ لہٰذا اس کے ثبوت کے لیے اس کے ظاہری ذریعہ ہی کو کافی مانا جاوے گا یعنی نکاح کو، اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس کو بالاتفاق صحیح النسب کہا جاتا ہے اور اس کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس میں بھی تو یہی ماننا پڑتا ہے کہ ظاہری سبب یعنی نکاح موجود ہے اس وجہ سے حقیقی سبب یعنی جماع کو بھی مان لیا گیا اور اس کی نسبت ناکح (۲) کی طرف کی گئی اور اس کو باپ کہا گیا ورنہ یہ علم کیسے ہوا کہ وہ بچہ واقع میں کس کا ہے حقیقی سبب کو تو کسی نے دیکھا نہیں اور ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ خاوند کے ہوتے ہوئے بھی دوسرے کا حمل ہو گیا۔

اس معنی کو تو حضرت عبداللہ بن سلام اس آیت کے متعلق کہتے ہیں ”یعرفونہ کمایعرفون ابناءھم“ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اہل کتاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (بوجہ دلائل قویہ کے) ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں تو حضرت عبداللہ بن سلام

(۱) پوشیدہ بات (۲) جس سے نکاح ہوا یعنی شوہر۔

کہتے ہیں کہ اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں تو ہم کو کوئی شبہ بھی ہے۔ ''انالاندری ماتصنع نساءنا''، یعنی ہم کو کیا معلوم ہے کہ ہماری عورتیں کیا کیا خیانت کرتی ہیں ہمارے پاس اس کی کون سی قطعی دلیل ہے کہ ہمارے بیٹے ہمارے ہی نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہمارے پاس قطعی دلیلیں موجود ہیں جن میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ غرض علم یقینی اس کا کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ یہ بچہ اپنے باپ کا ہی ہے۔ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے یا میاں بیوی کو ہے باقی دوسرے لوگ جس کو صحیح النسب مانتے ہیں اس کی نسبت کون سا علم یقینی رکھتے ہیں۔ بجز اس کے اس قاعدہ کو مان لیں کہ جائز طریقہ اور ذریعہ نسب کا ہوتے ہوئے کسی کی طرف بدگمانی جائز نہیں اور بشرط امکان نسبت باپ ہی کی طرف کی جائے گی اور امکان اس صورت متکلم کا اوپر ثابت ہوچکا ہے اور یہی مطلب ہے الولدللفراش (۱) کا لیجئے۔ عقلاً ثابت ہوگیا کہ شرعی اصول کس قدر صحیح ہے۔ اب تو معترض کو لینے کے دینے پڑ گئے ہوں گے کیونکہ اس شبہ سے تو اپنے ہی نسب میں کلام ہوگیا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کہنی چاہیے شریعت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ غرض نسب کے بارے میں سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جائز ذریعہ ہوتے ہوئے اس کو باپ کے ساتھ ملحق کرنا چاہیے خواہ حقیقت میں کچھ ہی ہو اب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس کے معنی کیا ہیں کہ وہ بچہ جس کا باپ عرصہ سے غائب ہے اسی باپ کا ہے وہ معنی یہی ہیں کہ قانون میں اس کا بیٹا ہے۔ گو حقیقت میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

قانون کی اہمیت

اور قانون بھی بڑی چیز ہے اگر ہر بات میں واقعیت پر نظر رکھی جائے تو دنیا کا کام چل ہی نہیں سکتا کسی کو کسی مال کا مالک کہا جاتا ہے تو کیا اس پر کوئی ایسی دلیل ہوتی ہے جس میں جانب مخالف کا احتمال ہی نہ ہو۔ بہت سے بہت یہ کہ مثلاً جائیداد کی تحریر یعنی بیع نامہ موجود ہے مگر کیا اس میں کسی درجہ میں یہ احتمال نہیں ہے کہ فرضی اور جعلی ہو

(۱) بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا یعنی جس کے نکاح میں عورت ہے۔

ایسے تو واقعات بہت ہوتے ہیں۔ کوئی شاید کسی کو خیال ہو کہ اس پر شہادتیں موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں جیسے بیع نامہ بن سکتا ہے شہادتیں بھی بن سکتی ہیں۔ غرض احتمال کو بڑی گنجائش ہے کوئی کام دنیا کا ایسا نہیں جس کے ثبوت میں کوئی قریب یا بعید احتمال نہ نکالا جاسکے۔ سو اگر واقعات پر نظر رکھی جائے تو تمام کام بند ہوجائیں۔ لامحالہ قانون ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔

لفظ عند کا معنی

جس کی اصل صرف یہ ہے کہ ایک چیز کے دلائل صحیحہ دیکھ کر اس کا حکم کر دیا جاتا ہے گو اس میں احتمال جانب مخالف کا بھی ہو اب سب کے مسئلہ سے بھی شبہات جاتے رہے اور قانون کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔ پس عند کے ایک معنی یہی حکم قانونی ہے جو اس آیت میں مراد ہے۔ ''فاولئك عنداللّٰه هم الكاذبون'' پس اس کے معنی یہ ہوگئے کہ درصورت پوری شہادت نہ لاسکنے کے قانون الٰہی میں یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ سو ایک تو معنی عند کے یہ ہوئے جس کے بیان میں استطراداً بہت سی زائد باتیں آگئیں مگر نفع سے خالی نہیں اور بعض وقت عند کے معنی ایک اور بھی ہوتے ہیں وہ معنی قرب کے ہیں جیسے اس آیت میں ہے إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿٥٤﴾ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾ (۱) جس کا حاصل یہ ہے کہ متقین جنت میں اور نہروں میں اور عیش اور آرام میں ہوں گے حق تعالیٰ کے پاس۔ ظاہر ہے کہ یہ قرب مراد ہے سو اس آیت میں جس کا بیان ہو رہا ہے، لهم دار السلام عند ربهم (۲) نیز یہی معنی مراد ہیں لیکن چونکہ یہ وعدہ تمام مومنین کے لیے عام ہے چنانچہ لہم کی ضمیر ''من يرد الله ان يهديه'' کی طرف راجع ہے یعنی تمام مومنین کے لیے دارالسلام ہوگا خدائے تعالیٰ کے پاس اور ظاہر ہے کہ سب مومنین قرب اصطلاحی میں برابر ہیں نہیں (۳) اس واسطے عند کا ترجمہ قریب کے ساتھ کرنے میں ابہام رہتا ہے مساوات (۴) کا اور قرآن میں عند ربهم کے معنی بعض جگہ فی الدار الآخرۃ (۵) بھی وارد

(۱) '' پرہیزگار لوگ باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔ ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس'' القمر: ۵۴۔۵۵ (۲) ان کے لیے خدا کے پاس آخرت میں سلامتی کا گھر ہے (۳) قرب الٰہی میں تمام مؤمنین برار نہیں ہیں (۴) برابری کا شبہ رہتا (۵) آخرت کے گھر میں۔

ہیں۔ پس یہاں یہی مناسب ہے لہٰذا سہل اور واضح ترجمہ عند ربہم کا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا کے پاس جا کر یعنی آخرت میں تو اب ترجمہ یہ ہوگیا کہ مومنین کے لیے امن کا گھر ہوگا آخرت میں۔

قرب کے درجات

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں نے عند ربھم کا ترجمہ یہ کیوں کیا تھا کہ آخرت میں اب صرف یہاں ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کے پاس سے مراد آخرت ہی کیوں لی گئی خدائے تعالیٰ سے ایسا قرب تو ہم کو دنیا میں بھی حاصل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرب کے درجات مختلف ہیں ایک قرب تو حقیقی ہے جس کا ترجمہ مل جانے سے کرلو یا ادراک حقیقت سے یا اسی کے ہم معنی جس لفظ سے چاہو کرو اور ایک قرب مجازی ہے جس کا حاصل رفع یا تقلیل حجب ہے(۱) جیسا کہ آگے آتا ہے۔ ''سو قرب بالمعنی الاول'' یعنی قرب حقیقی بمعنی مل جانے کے یا ادراک حقیقت (۲) کے تو کسی کو حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ جسم اور مکان سے پاک ہیں۔ تو مل جانے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتے اور رہا ادراک حقیقت (۳) سو وہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ادراک چاہتا ہے احاطہ کو اور بندہ ممکن ہے اور حق تعالیٰ واجب اور ممکن متناہی ہوتا ہے(۴) اور واجب لا متناہی (۵) پھر لامتناہی کو متناہی کیسے محیط ہوسکتا ہے۔ اس لیے غرض قرب بایں معنی تو ہو نہیں سکتا اس پر شاید کوئی اشکال کرے کہ رویت حق تعالیٰ (۶) کا مسئلہ ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رویت بے حجاب (۷) ہوگی۔ جب کوئی حجاب نہ رہا تو قرب حقیقی تو ہوگیا پھر یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ قرب حقیقی حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔

---

(۱) پردوں کا اٹھ جانا یا کم ہونا مراد ہے (۲) یہ تو کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقتاً اللہ سے مل لے یا اس کی حقیقت کا ادراک کرلے (۳) حقیقت معلوم کرلینا (۴) حد مقرر ہوئی ہے (۵) کوئی حد نہیں ہوتی (۶) اللہ پاک کو دیکھنا ثابت ہے (۷) بے پردوں کے ہوگی۔

رویت بے حجاب ہونے کا مفہوم

اس کا حل یہ ہے کہ رویت بے حجاب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی حجاب بھی نہیں رہے گا بلکہ یہ معنی ہیں کہ بعض حجاب (۱) نہ رہیں گے اور تقلیل حجاب ہوجاوے گی۔ چنانچہ خود حدیث میں حجاب کا وجود آیا ہے۔ لا یبقیٰ علیٰ وجهه الا رداء الکبریاء یعنی نہیں باقی رہے گا ذات پاک حق تعالیٰ پر کوئی حجاب سوائے حجاب کبریا کے یعنی عظمت کے اس استثناء سے معلوم ہوا کہ یہ حجاب رہے گا۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ رویت کے بے حجاب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مطلق حجاب نہ رہے گا بلکہ یہ معنی ہیں کہ بعض حجاب نہ رہیں گے ورنہ استثناء کے کیا معنی۔ رہا یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ایسی ہوگی جیسے چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مانع نہیں رہے گا تو دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ رویت میں تو حجاب (۲) نہ ہوگا چودھویں رات کے چاند کی طرح، دیکھ لوگے مگر ادراک حقیقت میں حجاب (۳) رہے گا اور اہل حق کی بھی یہی تحقیق ہے کہ حق تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکتا اور اس پر ان کے پاس علاوہ حدیث کے آیت بھی دلیل ہے اور وہ آیت یہ ہے ''أَلَآ إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَيۡءٖ مُّحِيطُۢ ''(۴) کیونکہ ادراک حقیقت بھی احاطہ ہے اور حق تعالیٰ کو کوئی شے محیط ہے نہیں پس اس کی حقیقت کا بھی کوئی مدرک نہیں، پس ادراک کا امتناع (۵) تو اس طرح ہوا اور وصل حسی کا امتناع بوجہ تنزلہ عن الجسم (۶) کے ہوا اس لیے اور یہی دو فرد تھیں قرب حقیقی کی اس لیے یہ توقع بالکل نہیں ہوسکتی کہ قرب اس معنی کو حاصل ہو کہ ادراک حقیقت ہوجاوے یا اتصال ہوجاوے ہاں اور کسی معنی کو قرب ہوگا۔ یعنی تقلیل حجب (۷) اور یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ظاہراً امتناع احاطہ بالحق سے (۸) حسرت ہوسکتی ہے کہ افسوس ہم اگر محیط ہوتے

(۱) بعض پردے اٹھادئے گئے (۲) دیکھنے میں تو کوئی پردہ حائل نہیں ہوگا (۳) اللہ کی حقیقت معلوم کرنے میں پردہ حائل ہوگا (۴) ''آگاہ ہوجاؤ اللہ نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے'' فصلت: ۵۴ (۵) ممانعت (۶) حسی ملاقات اس لیے ممکن نہیں کہ اللہ جسم نہیں ہے (۷) یعنی پردوں میں کمی ہوجائیگی (۸) حق تعالیٰ کا احاطہ نہ ہونے سے افسوس ہوسکتا ہے۔

توخوب لطف ہوتا جیسے محبوب کو آغوش میں لینے سے لیکن عاشق اسی سے زیادہ تو خوش ہوسکتا ہے کہ وہ محیط ہے اس لیے ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ عاشق معشوق کے ہاتھ کو دبائے جس میں عاشق کا ہاتھ معشوق کے ہاتھ کو محیط ہوا اور ایک یہ صورت ہوتی ہے کہ محبوب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبائے۔اس صورت میں محبوب کا ہاتھ عاشق کے ہاتھ کو محیط ہوا(۱)۔ظاہراً تو دوسری صورت پہلی سے کم درجہ کی معلوم ہوتی ہے لیکن عاشق سمجھتا ہے کہ زیادہ لطف دوسری ہی صورت میں ہے اسی کو ایک عاشق کہتا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم کہ شاید دست ہن بارو گر حبانان من گیرد(۲)

عاشق کا مذاق

اور عاشق کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ قرب کامل تو دور رہا اس کو تو اگر یہ بھی امید ہو کہ کبھی میری طرف گوشہ چشم ہی (۳) سے دیکھ لیا جائے گا یا کبھی میرا نام ہی اس محفل میں آجائے گا تب بھی پھولا نہ سمائے گا اور یہ تو بہت بڑی بات ہے کہ اس کا ہاتھ محبوب پکڑ لے اور یہ دوسری صورت کہ محبوب اس کا ہاتھ دبائے۔اس پہلی صورت سے کہ یہ محبوب کا ہاتھ دبائے عاشق کے مذاق میں اس واسطے زیادہ پر لطف ہے کہ اس میں عنایت محبوب کی طرف سے پائی جاتی ہے اور پہلی صورت میں صرف عاشق ہی کی طرف سے توجہ ہے۔بہرحال حق تعالیٰ کی عظمت حاجت عن ادراک الحقیقت ہے (۴) جنت میں بھی رویت تو ہوگی مگر حق تعالیٰ سے کسی کو یہ قرب بھی نہیں ہوسکتا تا کہ ادراک حقیقت ہوجاوے اس سے تو قطع نظر ہی کر لینی چاہیے۔اسی بارے میں صوفیاء نے کہا ہے:

حق تعالیٰ کا ادراک

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را(۵)

(۱)محبوب نے عاشق کے ہاتھ کو گھیرا ہوا ہے(۲)''اگرچہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا ہاتھ دوبارہ پکڑے'' (۳)نظر کے کنارے سے (۴)اللہ کی عظمت کا یہ مقتضاء ہے کہ اس کی حقیقت کو آدمی معلوم نہ کر سکے(۵)''جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کرسکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے۔اسی طرح ان کی ذات کا ادراک نہیں کرسکتا اس لیے فکر و سوچ بے کار ہے''۔

کہاں ذات حق باقی اور کہاں بندہ فانی اور (۱) کہاں قدیم اور کہاں حادث (۲) اور کہاں واجب الوجود اور کہاں ممکن (۳) اور کہاں لا متناہی اور کہاں متناہی (۴)۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک (۵) جب یہ قرب محال ہے تو اگر قرب ہوسکتا ہے تو اتنا ہی کہ حجابات کی تقلیل (۶) ہوجائے اور گو اس قسم کا قرب حق تعالیٰ سے دنیا میں بھی حاصل ہے مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا میں حجاب بہت زیادہ ہیں اور آخرت میں بہت کم ہوں گی اور دنیا میں جو یہ زیادہ حجب ہیں یہ بھی حجاب ادھر سے نہیں ہیں بلکہ ادھر (۷) سے ہیں کیونکہ ان کا حاصل ہستی دنیوی (۸) ہے کہ یہاں کی حیات تمام وجوہ سے نہایت ناقص ہے اور یوں تو ممکن کا وجود ہمیشہ ہی ناقص ہے کیونکہ ہر وقت اس پر فنا طاری ہے پھر اس میں سے بھی دنیوی وجود کہ وہ تو بالکل ہی ناقص ہے جس کو کالعدم سمجھ کر فرمایا گیا ہے: ''لا عیش الا عیش الآخرۃ'' یعنی زندگی ہے تو آخرت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی ہی نہیں ہے تو یہاں کی ہستی نہایت ہی ضعیف ہے (۹) اور بوجہ ضعف کے متحمل (۱۰) اس قرب کے بھی نہیں جو آخرت میں ہوگا یعنی رویت اور یہی نکتہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا ارنی یعنی اے اللہ مجھے اپنا دیدار دکھادیجئے تو حق تعالیٰ نے جواب دیا لن ترانی جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نہیں دیکھ سکتے یوں نہیں فرمایا لن اری کہ میں نہیں دیکھا جاسکتا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ ادھر سے قابلیت دیکھے جانے کی نہیں بلکہ ادھر سے استعداد دیکھنے کی نہیں ہے اسی کو میں نے یہی کہا تھا حجاب ادھر سے نہیں بلکہ ادھر سے ہے تو ہستی دنیوی اس قدر ضعیف ہے کہ اس میں استعداد نہیں ہے رویت کی اور آخرت میں قوت بڑھ جاوے گی لہٰذا دیکھ سکیں گے۔

(۱) کہاں اللہ پاک کی ہمیشہ قائم رہنے والی ذات اور کہاں بندہ جو فنا ہونے والا ہے (۲) کہاں ہمیشہ قائم رہنے والا اور کہاں ختم ہونے والا (۳) کہاں وہ ذات جو خود بخود موجود ہو اور کہاں وہ جو اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہو (۴) کہاں وہ ذات جس کی کوئی حد نہ ہو اور کہاں محدود ذات (۵) مٹی کو عالم پاک سے کیا نسبت (۶) پردے کم ہوجائیں (۷) اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ بندے کی طرف سے ہیں (۸) دنیوی حیات (۹) دنیا کا وجود بہت کمزور ہے (۱۰) اپنی کمزوری کی وجہ سے اللہ کے قرب کا متحمل نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے قرب ہر وقت ہے لیکن ہستی دنیاوی حجاب اعظم ہے آخرت میں یہ حجاب کم ہوجاوے گا اس لیے قرب زیادہ ہوگا۔ لہٰذا قرب آخرت کو عند ربھم کہا گیا تو اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ مومنین کے لیے سلامتی کا گھر یعنی بہشت (۱) ہوگا آخرت میں۔

ولی کے معنی

ایک ثمرہ تو یہ ہوا کہ جس کا حاصل میں نے شروع ہی میں بیان کردیا تھا کہ امن عن الآفات علی وجہ الکمال (۲) ہے۔ اور دوسرا ثمرہ حصول راحت علی وجہ الکمال (۳) وہ اس جملہ میں ہے وھو ولیھم بما کانوا یعملون (۴) اور ولی کے معنی دونوں آتے ہیں محب بھی اور محبوب بھی تو آیت کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے محبوب ہیں تو یہ محب ہوئے یعنی ان کو محبین میں داخل فرمالیں گے اور یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے محب ہیں یعنی ان کو محبوب بنالیں گے، دونوں میں سے کوئی بات بھی ہو، بندہ کے لیے تو بڑے ناز کی بات ہے۔ ایک عاشق کہتا ہے:

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے عجب

یعنی مجھے تو اتنا ہی بہت ہے کہ اس کا دامن ہاتھ میں آجائے یعنی کچھ تعلق پیدا ہوجائے پھر نتیجہ خواہ یہ ہوا کہ وہ مجھ کو کھینچ لیں یعنی مجھ کو مطلوب اور محبوب بنالیں یا میں کھینچ لوں یعنی محب بن جاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ تعلق پیدا ہوجائے پھر نتیجہ ان دونوں میں سے ایک ضرور ہوگا اور ایک کیوں ہوگا دونوں ہی ہوں گے۔

محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں

راز اس کا یہ ہے کہ اس سرکار میں محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں (۵) جہاں محبیت ہے وہاں محبوبیت بھی ہے اور جہاں محبوبیت ہے وہاں محبیت بھی

(۱) جنت (۲) آفات وبلیات سے انتہائی درجہ پر سلامتی ہے (۳) ''انتہائی درجہ پر راحت وسکون حالک گویا'' (۵) ''اور اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت ہے ان کے اعمال کے سبب'' (۵) ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

ہے اسی معنی کو کہا ہے:

ہر کہ عاشق بینیش معشوق داں گو بہ نسبت ہست ہمیں وہم آں (۱)

اور اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجو شد آیت از بالاؤ پست (۲)

چنانچہ صاف فرماتے ہیں:

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

یعنی جیسا کہ پیاسے پانی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایسے ہی پانی بھی خود پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے۔ دیکھ لیجئے پیاسوں کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا تو پانی جو مطلوب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت طالب یعنی مقتضی ہے وجود عطشاں (۳) کو اور پیاسا جو طالب سمجھا جاتا ہے اس اعتبار سے مطلوب ہے تو طالبیت اور مطلوبیت (۴) دونوں طرف سے ہوئی۔ یہ حالت تو مخلوق کی باہم ہے اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ علاقہ (۵) پیدا کرے تو خدا تعالیٰ تو بہت کریم ہیں ذرا سا بہانہ ڈھونڈتے ہیں، ادھر سے ارادہ ہوا اور ادھر سے خود کرم فرماتے ہیں تو جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرے گا خدا تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ محبت کریں گے۔ جب ادھر سے محبت ہوئی تو یہ محبوب ہو گیا نتیجہ یہی ہوا کہ محبیت کے لیے محبوبیت (۶) لازم ہے۔ چنانچہ ایک جگہ صاف فرماتے ہیں: ''يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ'' اس سے اوپر ارشاد ہے: ''إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي'' (۷) اور یہ اس کا ثمرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے محب ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا

(۱) ''جو آج عاشق ہے وہی معشوق بھی ہوگا دونوں میں یہ نسبت ہے کہ یہ اس کی چاہتا ہے وہ اس کو چاہتا ہے'' (۲) ''پیاسے کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو پانی کا طالب ہے تو سمجھ لے کہ تو مطلوب بھی ہے جیسے تو پانی کو ڈھونڈتا ہے ایسے پانی بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے'' (۳) پانی جس کو مطلوب سمجھا جاتا ہے وہ حقیقت میں خود پیاسوں کی تلاش میں ہے (۴) دونوں ایک دوسرے کے طالب بھی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے مطلوبات بھی ہیں (۵) تعلق قائم کرلے (۶) محبت کرنے والے کے لیے محبوب ہونا لازم ہے (۷) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔

اتباع کرو، حق تعالیٰ تم کو محبوب بنالیں گے۔ یہاں بظاہر موقع تحب اللہ کا تھا یعنی تمہارا محب ہونا اس وقت معتد بہ ہوگا جب تم اتباع کرو اس سے تم اللہ کے محبین میں شمار ہوسکتے ہو۔ سو یہ نہیں فرمایا بلکہ یُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ فرمایا یعنی ایسا کرنے سے تم کو حق تعالیٰ اپنے محبوبین میں داخل کرلیں گے۔ یہ آیت تو بالکل ہی صریح ہے اس باب میں کہ محبیت کے لیے محبوبیت لازم ہے اور بہت آیتوں میں یہ مضمون آیا ہے مثلاً وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ (۱) اور وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلصَّٰبِرِينَ (۲) وغیرہ وغیرہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں یحب کے معنی یہی تو ہیں کہ محبت رکھیں گے۔ اس کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف ہے تو فاعل اس کی ذات حق ہوئی اور محبت کے فاعل کو محب کہتے ہیں اور مفعول اس کا صابرین یا شاکرین ہیں بلفظ دیگر مومنین ہیں اور محبت کے مفعول کو محبوب کہتے ہیں تو مومنین کے لیے بشارت ہوئی محبوب بنالینے کی۔ یہ مضمون جابجا آیات میں موجود ہے اور يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ میں تو بالکل ہی صاف موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، کتنی بڑی بات ہے اس پر تو عاشق کو شادی مرگ ہوجائے (۳) تو عجب نہیں عاشق کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اتنا بھی سن لے کہ محبوب نے میرا نام لیا تو پھولا نہیں سماتا اور کہاں اتنا بڑا لفظ کہ مجھ کو پسند کرلیا۔

اداء حق محبت عنایتے است زودست وگرنہ عاشق مسکین ہیچ خورسنداست (۴)

محبوبیت کا لفظ تو بہت ہی بڑا ہے عاشق کے لیے تو محبین ہی میں شمار ہوجانا بڑے سے بڑا درجہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

ہمینم بس کہ داند ماہرویم کہ من نیز از خریداران اویم (۵)

ہمینم بس اگر کاسد قماشم کہ من نزی از خریدار انس باشم (۶)

(۱) ''اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں'' (۲) ''اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں'' (۳) خوشی سے مرنا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں (۴) محبت کا حق ادا کرنا یہ ان کی مہربانی ہے ورنہ عاشق مسکین تو ان سے تعلق ہونے ہی میں خوش ہے (۵) ''میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ محبوب کو پتہ لگ جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں'' (۶) ''مجھے تو یہی بات کافی ہے کہ میرے محبوب کو پتہ لگ جائے میں بھی اس کے چاہنے والوں میں ہوں''۔

عاشق کا حوصلہ تو اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو محب اور بلفظ دیگر عاشق کہہ دیا جائے اور اگر خود محبوب ہی اس کی نسبت یوں کہہ دے کہ یہ میرا عاشق ہے تو شاید مرا ہوا بھی جی جائے یا جیا ہوا مر جائے اور دوسرے محبوبوں سے تو اتنی بھی توقع ہونا مشکل ہے کہ اپنے طالب کو عاشق ہی کہہ دے لیکن حق تعالیٰ کا فضل ہے اور غایت کرم ہے کہ اپنے ناچیز بندوں کو محبوبیت کی بشارت سناتے ہیں (۱) ان کی نعمتوں اور رحمتوں اور آفتوں کی کیا حد ہو سکتی ہے جو کچھ ہے ادھر سے ہی ہے اور بندہ کو تو اگر محبیت (۲) بھی نصیب ہوتی تو فی الحقیقت انہی کی دی ہوئی ہوتی۔ گو ظاہراً بندہ کا فعل ہوتا اور محبوبیت میں تو بندہ کا کوئی اختیار ہی نہیں وہ تو ہر طرح انہیں کی دی ہوئی ہے۔ غرض یہ اس آیت سے خوب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ محبیت کو محبوبیت لازم ہے۔

محبوبیت کو محبیت لازم ہے

اور اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس عکس بھی ثابت ہے یعنی محبوبیت کو محبیت لازم ہے تو آیت میں لفظ ولیھم کو معنی میں محب کے لو تب بھی اور محبوب کے لو تب بھی اس سے محبیت بھی ثابت ہوگئی اور محبوبیت بھی تو معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ مومنین کو یہ ثمرہ بھی دیں گے کہ محب بھی بنالیں گے اور محبوب بھی بنالیں گے اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ دلالت آیت کی دونوں مضمونوں پر بطریق عموم مشترک کے نہیں ہے کبھی کوئی مولوی صاحب اعتراض کریں بلکہ ایک مضمون پر دلالت مطابقی ہے اور دوسرے پر التزامی ہے یعنی ولیھم کو دونوں معنوں میں ایک وقت میں نہیں لیا گیا بلکہ ایک معنی میں لیا گیا ہے اور دوسرے معنی بوجہ لازم ہونے کے ثابت ہو جاتے ہیں، یہ بحث تو طالب علمانہ تھی۔ مقصود یہ ہے کہ ولیھم میں دوسرے ثمرہ کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مومنین کو حق تعالیٰ اپنا محب اور محبوب بنالیں کہ اس کو میں نے دوسرا ثمرہ کہا تھا اور اس کا حاصل حصول راحت نکالا تھا۔ پس ایک ثمرہ تھا دفعہ مضرت (۳) جو حاصل تھا اول جملہ

(۱) یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ اللہ نے اُن کو اپنا محبوب بنالیا (۲) اگر اللہ سے محبت بھی نصیب ہو جاتے تو یہ انہی کا کرم ہے (۳) نقصان کا رفع ہونا۔

یعنی لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ رَبِّهِمْ کا دوسرا ثمرہ حصول راحت ہے جس کو میں نے ثابت کیا ہے ''وھوولیھم'' سے جس کا حاصل دو امر ہیں محب بن جانا خدا تعالیٰ کا اور محبوب بن جانا اور دونوں امر کو جامع ایک لفظ محبت ہے تو حاصل یہ ہوا کہ مومنین کو محبت حاصل ہوگی محبت مصدر ہے اس کو مضاف کرو فاعل کی طرف تو محبیت کے معنی ہوجاتے ہیں اور مضاف کرو مفعول کی طرف تو محبوبیت کے معنی ہوجاتے ہیں۔ غرض دونوں معنوں کے لیے جامع لفظ محبت ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ مومنین کو محبت حاصل ہوگی اور میں نے ان دونوں ثمروں کی نسبت اوپر کہا تھا کہ کامل ہوں گے سود فع مضرت کے کامل (۱) ہونے کو تو میں اوپر ثابت کر چکا۔ اب اس دوسرے ثمرہ کے کمال کو ثابت کرنا رہ گیا یعنی حصول راحت بھی علی وجہ الکمال ہوگا (۲)۔

راحت کی روح

اس بیان کے لیے ضرورت ہے ایک مقدمہ کی وہ یہ ہے کہ راحت کی روح ہے خوشی اور یہ نہ ہو تو تمام نعمتیں بیکار ہیں۔ مثلاً ایک شخص لکھ پتی ہے مال بھی ہے اولاد بھی ہے مکان بھی ہے ہر قسم کی آسائش کا سامان مہیا ہے لیکن فرض کر لیجئے کہ اس پر ایک مقدمہ قتل کا قائم ہوگیا ہے تو سامان راحت کا سب موجود ہے مگر چونکہ اس راحت کی روح یعنی خوشی اور اطمینان قلب موجود نہیں لہٰذا سب سامان بیکار ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے اس کو کچھ طول دینے کی ضرورت نہیں مگر جس بات کو میرے مدعا میں دخل ہے وہ یہ ہے کہ ہر چیز کی راحت اس کے مناسب چیز سے ہوتی ہے آنکھ کی راحت اچھی اچھی چیزوں کے دیکھنے سے اور کان کی راحت اچھی اچھی باتوں کے سننے سے علیٰ ہذا قلب کی راحت سب سے زیادہ ہوتی ہے محبت سے جب مومنین کے لیے محبت ثابت ہوگئی تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکلا کہ جو سب سے بڑی چیز راحت کی ہے وہ حاصل ہوگئی کیونکہ آنکھ، کان وغیرہ یہ سب قلب سے درجہ میں کم ہیں اور قلب کے لیے أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ

(۱) نقصان بالکلیہ منقطع ہوجائے گا (۲) راحت بھی کامل درجہ میں حاصل ہوگی۔

مناسب ہے تو جو فرق اور اعضاء اور قلب میں ہے وہی فرق ان دونوں کی راحتوں میں بھی ہوگا۔ پس محبت سب راحتوں سے بڑھ کر راحت ہوئی جب وہ محبت مومنین کو حاصل ہوئی تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ سب سے بڑی راحت ان کو نصیب ہوگئی جس کی تمام راحتیں تابع ہیں تو یہ بات صحیح ہوگئی کہ حصول راحت علیٰ وجہ الکمال ہوگا۔ ایک بات یہاں یہ بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ ولی کے معنی میں قرب بھی ماخوذ ہے(۱) تو یہ معنی ہوئے کہ حق تعالیٰ کو ان سے قرب بھی ہے۔ اب یہاں دو دعوے ہوئے اول یہ کہ خود محبت بھی راحت ولذت کی چیز ہے چاہے قرب بھی نہ ہو یہ محبت بھی وہاں ہوگی اور اس پر دوسرا یہ کہ اس پر قرب بھی مزید برآں ہوگا تو اب تو حصول راحت علیٰ وجہ الکمال کہنے میں کچھ بھی تردد نہ رہا۔ اگر کوئی کہے کہ ایک شاعر نے تو اس کے خلاف کہا ہے:

جو مزا انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

اس میں صاف بتلا رہا ہے کہ محبت میں مزا ہے قرب میں نہیں تو اول تو یہ شعر غلط ہے اور مذاق سلیم کے خلاف ہے اگر ایسا ہوتا تو عشاق وصال کی تمنا کیوں کیا کرتے اور اگر من کل الوجوہ غلط(۲) بھی نہ کہا جائے تو میں ثابت کرتا ہوں کہ مومنین کو یہ بھی نصیب ہوگا یعنی جنت میں انتظار کی لذت بھی ہوگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ قرب بھی ہوگا اور انتظار بھی۔ بیان اس کا یہ ہے کہ محبوب حقیقی سے وصل حقیقی ممکن نہیں (۳)۔ جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ وصل حقیقی چاہتا ہے اتصال (۴) کو یا علم بالکنہ (۵) کو اور اتصال حق تعالیٰ (۶) سے ممکن نہیں کیونکہ ذات حق تجسم سے پاک (۷) ہے اور علم بالکنہ احاطہ (۸) اور حق تعالیٰ محیط ہیں نہ کہ محاط جب وصل حقیقی نہ ہوگا تو پوری سیری بھی (۹) نہ ہوگی اور مزید قرب کا انتظار رہے گا اور یہ حالت ہوگی کہ وصل بھی ہے اور مزید کا انتظار بھی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

(۱) ولی کے ایک معنی قرب کے بھی آتے ہیں (۲) بالکل غلط بھی نہ کہا جائے (۳) اللہ تعالیٰ سے وصل حقیقی معنی میں ممکن نہیں (۴) دونوں کے مل جانے کو (۵) باحقیقت سے واقف ہونے کو (۶) اللہ سے بالکلیہ ملنا ممکن نہیں کیونکہ اس کے لیے جسم ہونا شرط ہے (۷) اللہ تعالیٰ جسم ہونے سے پاک ہے (۸) حقیقت کا علم احاطہ کو چاہتا ہے اللہ کا احاطہ کوئی نہیں کر سکتا اللہ سب کا احاطہ کیا ہوا ہے (۹) جب حقیقی وصل نہ ہوا تو مکمل تشفی بھی نہ ہوئی بلکہ مزید قرب کا انتظار ہوگا۔

دلا رام در بردلا رام جو لب از تشنگی خشک وبرطرف جو
نہ گویم کہ برآب قادر نیند کہ برحل نیل مستسقی اند(۱)

اور راز اس میں یہی ہے کہ بندہ متناہی ہے اور حق تعالیٰ لامتناہی تو جو مرتبہ بھی وصال کا لیا جائے ایسا نہیں ہوسکتا کہ اور مرتبہ نہ ہو:

جنت میں انتظار کی لذت ہوگی

شاعر کہتا ہے:

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گل چنیں بہار تو رد اماں گنہ(۲)

سبحان اللہ اس کا کیا بیان ہوسکتا ہے لامتناہی کا بیان بھی کوئی کیسے کرے کیونکہ بیان بھی تو متناہی ہوگا پھر اس کو کیسے محیط ہوسکتا ہے۔ غرض اگر وہ شعر کسی درجہ میں صحیح بھی ہو تب بھی وہ اشکال نہ رہا کہ جب انتظار نہ ہوگا تو کیا لطف ہوگا کیونکہ میں نے ثابت کر دیا کہ جنت میں انتظار بھی ہوگا تو اگر کسی کا یہی مذاق ہے کہ لطف بلا انتظار کے نہیں تو جنت میں یہ بھی ہوگا جس کی وجہ ابھی بیان کی ہے کہ وہاں حسن لامتناہی ہوگا اس لیے تمتع کے درجات بھی لا تقف عند حد (۳) ہوں گے اور ہر درجہ میں دوسرے درجہ کا انتظار ہوگا مگر یہ یاد رکھئے کہ ایک انتظار وہ بھی ہوتا ہے جس میں تڑپ اور بے چینی ہو، ایسا انتظار جنت میں نہ ہوگا کیونکہ جنت دارالسلام ہے وہاں کسی تکلیف کا کام نہیں اور ایسا انتظار تکلیف ہے اور تکلیف بھی کیسی جس کو کہا جاتا ہے الانتظار اشد من الموت(۴) تو ایسا انتظار تو وہاں کیسے ہوسکتا ہے جو انتظار وہاں ہوگا وہ زیادتی لذت کے لیے ہوگا وصال بھی ہوگا اور انتظار وصال بھی ہوگا۔ اس طرح کہ ایک تجلی خاص ہوگی اس سے جو کچھ لذت حاصل ہوگی اس کو کون بیان کرسکتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر تجلی کی خواہش ہوگی پھر اس سے بڑھ کر تجلی ہوگی پھر اس سے بھی بڑھ کر تجلی کی خواہش ہوگی اور پھر وہ تجلی ہوگی

(۱) ''محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلبگار'' (۲) ''نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بے شمار'' (۳) حصول لذت کے درجات کی بھی کوئی حد نہ ہوگی
(۴) انتظار کی تکلیف موت کی شدت سے بھی زیادہ ہے۔

وھلم جرا کہیں یہ ترقی ختم نہ ہوگی کیونکہ وہاں تناہی (۱) نہیں ہے۔ اس بیان کو طول اس شعر کی تحقیق کی وجہ سے ہوگیا جو مزا انتظار میں دیکھا الخ۔

اصل مضمون یہ تھا کہ ہر چیز کی راحت اس کے مناسب چیز سے ہوا کرتی ہے اور قلب کے موافق اور مناسب چیز محبت ہے تو قلب کو محبت سے راحت پہنچتی ہے گو وصل بھی نہ ہو چہ جائیکہ وصل بھی ہو اور یہ محبت اس قدر لذت کی چیز ہے کہ بعض وقت اس محبت میں آدمی اس قدر محو ہوجاتا ہے کہ وصل کی بھی خبر نہیں رہتی۔ مجنوں کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ لیلیٰ سامنے آگئی تو وہ کہتا ہے من انت تو کون ہے یہاں تعجب ہوتا ہے کہ اس نے لیلیٰ کو پہچانا نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ غایت شوق میں ایسی محویت ہوگئی کہ کچھ بھی خبر نہ رہی حتی کہ محبوب کا بھی ادراک (۲) نہ ہوا مگر اس قصہ سے مقصود محض محبت کے لذیذ ہونے پر استدلال کرنا ہے باقی اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ وہ وصل سے افضل ہے یہ تو ظاہر ہے کہ محبت خود اس اصل ہی کی خواہش کا نام ہے تو جس کی خواہش کا نام محبت ہے یعنی وصل محبت محضہ اس سے کیسے افضل ہوگی البتہ دنیا میں کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ اس وصل پر محض محبت غالب آجاتی ہے جیسا کہ لیلیٰ کے قصہ میں ہوا کہ محبت میں ایسی لذت آئی کہ محویت ہوگئی حتی کہ محبوب کو بھی نہ پہچانا مگر وہاں ایسا نہ ہوگا کیونکہ وہاں مذاق صحیح ہوگا اس لیے وہ حالت نہ ہوگی جو مجنون کی ہوئی کہ محبوب تک کو نہ پہچانا۔ یہ ایک غلطی کا دفع تھا۔

اصل مضمون یہ بیان کررہا تھا کہ محب ہی ہر راحت کی بناء ہے جس چیز میں لطف آتا ہے محبت ہی سے آتا ہے محبت نہ ہو تو کسی چیز میں لطف ہی نہیں آسکتا۔ دیکھئے سب سے بڑی اور ضروری چیز جس پر تمام کارخانہ دنیا کا وجود بقاء موقوف ہے وہ کھانا ہے اس میں بھی اگر محبت نہ ہو یعنی کھانے کی خواہش نہ ہو تو لطف نہیں آسکتا اس وقت کھانا مٹی کے برابر معلوم ہوتا ہے اور یوں کوئی فاسد المذاق (۳) ہو کہ پیٹ بھی بھرا ہوا ہے اور طبیعت قبول نہیں کرتی مگر زبردستی کھائے چلا جارہا ہے بلکہ قے کرتا جاتا ہے اور کھائے چلا جاتا ہے تو ایسے مذاق والے کا تو ذکر ہی نہیں۔ مذاق صحیح کا ذکر ہے کہ بلا خواہش اور

(۱) انتہاء نہیں ہے (۲) محبوب کا بھی پتہ نہ چلا (۳) مزاج ہی خراب ہوئے۔

رغبت کے کھانے میں بھی لطف نہیں آتا خواہش رغبت محبت سب ایک ہی چیز ہے غرض ہر راحت کی اصل محبت ہی ہوئی اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ایک راحت ہی کی کیا تخصیص ہے ہر چیز کی اصل اور بنا محبت ہی ہے حتی کہ ایجاد عالم کی بناء بھی یہی محبت ہے۔ صوفیاء کی روایات میں ایک الہام ہے'' کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف''(۱) یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس واسطے میں نے عالم کو پیدا کیا۔ لفظ احببت محبت سے مشتق ہے اس میں اسناد محبت کی حق تعالیٰ کی طرف ہوئی ہے تو صاف یہی معنی ہوئے کہ خدا تعالیٰ کو اس امر سے محبت ہوئی کہ پہچانا جاؤں۔ لفظ محبت اس میں صریح مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ ایجاد عالم کی اصل بنا بھی محبت ہی ہوئی ہے یہ اور بات ہے کہ محبت کا اطلاق ذات حق تعالیٰ میں اس معنی پر اس معنی میں نہیں ہوسکتا جس معنی پر مخلوقات میں اطلاق ہوتا ہے کیونکہ مخلوقات میں تو محبت کے معنی میلان وکشش کے ہیں جس سے محب بالاضطرار(۲) محبوب کی طرف کھنچتا ہے اور ذات خداوندی میں اضطرار(۳) کا کچھ کام نہیں وہاں تو اختیار مطلق ہے محبت بھی اختیاری ہے وہاں محبت کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنے اختیار سے بلا کسی قسم کی کشش اور اضطرار کے ایک بات کو پسند کرنا۔

لفظ محبت کی ضروری تحقیق

محبت کے حکم کرنے میں آج کل لوگ سخت غلطی کرتے ہیں اور حق تعالیٰ پر اس کا حمل ایسی بہبودگی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس کے تصور سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ عوام کو ان باریک باتوں کی تمیز کہاں، خدا تعالیٰ کو عاشق اور شیدا(۴) وغیرہ کہہ ڈالتے ہیں جس میں یہی معنی ادا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کے ساتھ محبت، کشش اور اضطرار(۵) اور بے چینی کے ساتھ ہے جس طرح مخلوق میں ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس قسم کے

(۱) الدر المنتشرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ: ۱۲۶، الأسرار المرفوعۃ لعلی القاری: ۲۷۳ (۲) مجبور امحبوب کی طرف کھنچتا ہے (۳) مجبوری کا کوئی کام نہیں (۴) عاشق اور فریفتہ کے الفاظ بولتے ہیں (۵) اس کا مطلب ہے کہ کسی کی طرف کشش مجبوری اور بے قراری سے ہے۔

الفاظ حق تعالیٰ کی شان میں کہنا ہرگز جائز نہیں اس میں حق تعالیٰ کو مخلوق کے برابر کر دینا ہے اور سخت بے ادبی ہے یہ لفظ محب کی ضروری تحقیق تھی جو رفع غلطی کے لیے بیان کر دی گئی باقی محب کا اطلاق بمعنی ارادۃ الخیر (۱) حق تعالیٰ کے لیے بھی آتا ہے۔ چنانچہ لفظ احببت میں موجود ہے اور اس قسم کے لفظ قرآن شریف میں بھی بہت جگہ موجود ہیں جس میں محبت کا اطلاق حق تعالیٰ کے لیے آیا ہے۔ مثلاً واللّٰہ یحب الصابرین، واللّٰہ یحب المحسنین، یحببکم اللّٰہ، وغیرہ وغیرہ غرض جس طرح کہ محبت خدا تعالیٰ کے لائق ہے وہی محبت ایجاد عالم کا سبب ہوئی تو ثابت ہوا کہ محبت ہی بنا ہوئی ہے ایجاد کی جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا۔

محبت کی بناء

اور ایک بات اس سے اور بھی معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ محبت کی ابتداء ادھر سے ہوئی ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

عشق اول دردل معشوق پیدا میشود تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود (۲)

پھر اس کا عکس ادھر پڑا پھر جانبین میں تعلق ہوا مگر رنگ دونوں طرف مختلف ہیں۔ جیسا کہ سورج کی شعاع صاف اور نورانی ہوتی ہے لیکن سرخ رنگ کے شیشے میں پار ہو جانے سے سرخ دکھائی دیتی ہے اس سے سورج کا اور شعاع کا رنگین ہونا لازم نہیں آتا یہ وہی شعاع نورانی اور صاف ہے مگر سرخ شیشے سے تعلق ہو جانے سے اس میں رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ بلاتشبیہ یہی حالت محبت کی ہے کہ اُدھر سے صاف اور بے کیف اور ادھر سے بے چینی کے ساتھ اور سوز کے ساتھ اور درد کے ساتھ اور جو جو کچھ عاشق کی گتیں بنتی ہیں سب جانتے ہیں۔ ادھر تو یہ رنگ اور ادھر سکون کے ساتھ اور بلا اضطرار اور بلا بے چینی کے اور بلا سوز و گداز اور ہے دونوں طرف محبت۔ اسی کو عارف رومی کہتے ہیں:

(۱) بھلائی کا ارادہ کرنا (۲) عشق اول معشوق میں پیدا ہوتا ہے اگر شمع نہ جلتی تو پروانہ اس پر فدا کیسے ہوتا۔

عشق معشوقاں نہانست دستیر عشق عاشق باد وصد طبل ونفیر
لیک عشق عاشقاں تن رہ کند عشق معشوقان خوش وفربہ کند(۱)

وجہ یہ کہ اضطرار ایک صفت نقص ہے(۲) جس سے زات حق جل جلالہ منزہ ومبرّا ہے۔ گومحبت اس طرف کی مخلوق کی محبت سے بہت زیادہ ہے جس کا راز یہ ہے کہ محبت کی بناء ہے معرفت اور معرفت ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہی کو زیادہ ہے(۳) ہم کو خود اپنی بھی معرفت اتنی نہیں ہوسکتی جتنی کہ حق تعالیٰ کو ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حق تعالیٰ ہم کو ہم سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ کو ہم سے ماں سے بھی زیادہ محبت ہے اور یہ بات بہت ظاہر ہے کیونکہ ماں میں محبت کہاں سے آئی یہ حق تعالیٰ ہی کی محبت کا پرتو ہے اور یہ مضمون حدیث قدسی میں بھی ہے:

من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعاً تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ(۴) دیکھئے ادھر سے جتنا ظہور محبت کا ہوتا ہے اس سے زیادہ ادھر سے ہوتا ہے اس میں صریح دلالت ہے کہ ادھر ہی سے محبت زائد ہے وہ تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ ذرا کسی نے ارادہ کیا ان کی طرف آنے کا اور وہ خود اس سے ہزار ہا درجہ زیادہ اس کی طرف متوجہ جوجاتے ہیں۔ غرض محبت کی شان اور اس کا ہر راحت ولذت کے لیے بلکہ تمام عالم کے لیے اصل الاصول ہونا ثابت ہوگیا۔ اسی دولت کا ذکر ہے جملہ ''وھوولیھم'' میں۔ پس یہ جملہ جامع ہوا تمام راحات حصول(۵) کا اور پہلے جملہ جامع تھا تمام مضار کے زوال(۶) کا اور یہی حاصل ہوتا ہے تمام ثمرات کا تو اسلام پر ثمرات کاملہ کا

(۱) معشوقوں کا عشق پوشیدہ ہے اور عاشق کے عشق کا ہر طرف شور مچا ہوا ہے عاشق کے عشق کے نتیجہ میں جسم گھلتا ہے اور معشوق کے عشق کے نتیجہ میں جسم فربہ ہوتا ہے (۲) بے چینی ایک ناقص صفت کا نام ہے اور اللہ اس صفت سے پاک ہے (۳) محبت معرفت کی وجہ سے ہوتی ہے اور معرفت اللہ پاک کو زیادہ ہے پس محبت بھی ان کی زیادہ (۴) ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص کہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو کوئی میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے تو میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو کوئی میری طرف قدم قدم آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں'' مسند احمد: ۲/ ۴۱۳، کنزالعمال: ۱۱۷۹
(۵) اس جملہ سے ہر قسم کی راحت کا حاصل ہونا معوم ہوا (۶) پہلے جملے سے ہر قسم کے نقصان کے زوال کا علم ہوا

مرتب ہونا ثابت ہوگیا۔ یہ بیان ہوا لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُم (۱) کا۔

بغیر اعمال صالحہ کے صرف محبت کافی نہیں

اس کے بعد بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ یہ کہ بعض لوگ ایسے ہوس ناک ہوتے ہیں کہ محبت کو مقصود بالذات سمجھ کر اس میں ایک غلطی کر بیٹھتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ بس کامیابی کے لیے یہی کافی ہے کہ حق تعالیٰ سے ہمکو محبت ہے اور ہم سے ان کو محبت ہے اور یہ سمجھ کر عمل کا اہتمام مطلق نہیں کرتے اور جاہل صوفی اس غلطی میں بکثرت مبتلا ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ مراقبات وغیرہ میں مشغول رہیں گے وظیفے بہت پڑھیں گے کیفیات کی تحصیل میں سرگرم رہیں گے اگر کشف یا سلب مرض (۲) یا اور کوئی کیفیت حاصل ہوگئی تو اس میں مست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کمال حاصل ہوگیا، دن رات انہی دھندوں میں لگے ہوئے ہیں اور اعمال سے غافل (۳) ہیں اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہمکو محبت حاصل ہے اور محبت ہی ہے جو کچھ ہے۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ محبت کونسی درکار ہے (۴)۔

محبت کے لیے محض میلان قلب کافی نہیں

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ محبت بمعنی میلان قلب کافی نہیں یہ محبت تو ایسی ہے جیسے کوئی یہ خیال کرے کہ مجھے کھانے کی طرف تو رغبت ہے نہ کھانا پکائے اور نہ کھائے تو اس سے کیا ہوسکتا ہے، پیٹ نہیں بھر سکتا اور زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کھانے کی رغبت نے تو کچھ بھی کام نہ دیا ایسے ہی حق تعالیٰ کی طرف محض میلان قلب کام نہیں دے سکتا کیونکہ جب عمل نہیں اور رضا اسی پر موقوف ہے تو رضا حاصل نہیں اور وہی بڑا مقصود ہے تو اس محبت کا حاصل یہ ہوا کہ تم کو تو خدا تعالیٰ سے محبت ہوئی مگر خدا تعالیٰ کو تم سے نہ ہوئی تو یہ مطلوب نہیں بعض لوگ اسی کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں۔

---

(۱) ''ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور اللہ کو ان سے محبت ہے'' (۲) اگر یہ صفت حاصل ہوگئی کہ دوسرے کے حالات پر مطلع ہونے لگے یا توجہ کرنے سے دوسرے کا مرض زائل کر دیا یا اسی قسم کی کوئی اور صفت حاصل ہوگئی تو بہت خوش ہیں (۳) نیک عمل کرنے کی فکر ہی نہیں (۴) مطلوب۔

نسبت مطلوبہ

خوب سمجھ لو کہ نسبت مطلوبہ وہ ہے جو دو طرف سے تعلق (۲) ہو اور یہ موقوف ہے عمل پر نہ کہ صرف ایک طرف سے اس کی مثال تو اس طالب علم کے قصہ کی سی ہے کہ ایک طالب علم تھے دل لگی باز، ان کے ایک دوست نے پوچھا آج کل کس شغل میں ہو، کہا شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں، کہا مبارک ہو بڑا کام مارا کیا، اس کی کوئی صورت ہوگئی ہے، کہا جی ہاں آدھا کام بھی تو ہوگیا، آدھا باقی ہے پوچھا کیونکر کہا ہم تو راضی ہیں مگر وہ راضی نہیں تو آدھا کام ہوگیا ور آدھا باقی ہے تو بھلا اس سے کیا کام چلا کہ ہم راضی ہیں مگر وہ راضی نہیں اور کیا اس نیم رضا سے شہزادی مل گئی۔ اسی طرح یہ عاشق ہونے کے مدعی ہیں کہ وہ تو اللہ سے راضی ہیں مگر اللہ ان سے راضی نہیں بہت سے پڑھے لکھے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔

نسبت باطنی کو بلا اعمال کے کافی سمجھنا غلط ہے

کہ یہ لوگ نسبت باطنی کے معنی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ حق تعالیٰ سے لگاؤ پیدا کرلو اور لگاؤ کے معنی یہ لیے ہوئے ہیں کہ ہر وقت یاد رکھو، زبان سے یا خیال سے بس یہی کافی ہے اور اعمال کو مقصود نہیں سمجھتے خود اعمال کو بھی صرف یاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو جب یاد پیدا ہوگئی خواہ اعمال سے یا اور کسی ذریعہ سے تو اعمال کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ یہ لوگ کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اعمال کی مطلق پرواہ نہیں نہ نماز نہ روزہ نہ زکوٰۃ اور دوسرے اجزاء دین کا، تو کیا ذکر اگر کسی نے نماز پڑھی بھی تو ولایتی نماز جس کا نہ رکوع صحیح نہ سجدہ درست نہایت ہی بے توجہی کے ساتھ کیونکہ کوئی ضروری چیز تو ہے ہی نہیں یہ بھی ان کی عنایت ہے کہ ایسی بھی پڑھ لیں، البتہ تسبیحیں بڑی بڑی رکھتے ہیں ایک مٹروشاہ تھے۔ ان کے نام بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں جو بعضے خاندانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں شیطان شاہ لعنت شاہ وہ مٹروشاہ کہا کرتے تھے کہ تسبیح ایسی بڑی اور بھاری ہونی چاہیے

(۱) جس کا تعلق طرفین سے ہو

کہ ضرورت کے وقت ہتھیار کا بھی کام دے جائے اور کسی سے لڑائی بھڑائی ہوجائے تو سر پر ماردیں تو ایک دفعہ سر تو پھٹ جائے، کپڑے گیرواہوتے ہیں۔ غرض ہر بات میں تصنعات (۱) اوررسوم رہ گئے ہیں اسی کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں نسبت صوفیاء غنیمتے است کبری امارسوم شان بہیچ نیرزد (۲)۔ مگراب درویشی ان ہی رسوم کا نام رہ گیاہے جس میں رسوم نہ ہوں اس کو کہتے ہیں فلانے بزرگ مشہور تو بہت ہیں مگر ہم نے تو کوئی بات درویشی کی ان میں دیکھی نہیں واقعی گیرواکپڑے نہیں دیکھے، بڑی سی ٹوپی سر پر نہیں دیکھی، بڑی سی تسبیح گلے میں پڑی نہیں دیکھی، موٹا سا سونٹاہاتھ میں نہیں دیکھا، واہی تباہی الفاظ زبان سے بکتے نہیں دیکھا۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہوا کہ شریعت کے پابند ہیں وضع میں قطع میں بول چال میں معاشرات میں معاملات میں اور رسوم کوفضول سمجھتے ہیں اس واسطے درویش کہے جانے کے مستحق نہیں رہے غرض اس خیال میں بہت لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ وظیفے پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے تصور کا لگاؤ پیدا کرلینا کافی ہے نماز روزے کی ضرورت نہیں اسی پر بھولے بیٹھے ہیں اور اسی کو کمال اور وصول سمجھتے ہیں (۳)۔ خیر یہ تو جہلاء کی باتیں ہیں اور بعضے یہ تو نہیں کہتے کہ نماز روزے کی ضرورت نہیں مگر ایک غلطی میں وہ بھی مبتلا ہیں اور یہ بات اچھے اچھے سمجھ داروں اور ذاکرین میں بھی پائی جاتی ہے کہ اعمال کے ساتھ قلت اہتمام (۴) ہے جس اہتمام کے ساتھ وظیفے اور اشغال وغیرہ کرتے ہیں اہتمام کے ساتھ اعمال نہیں کرتے۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ صرف لگاؤ اور نسبت کو گو یک طرفہ ہی ہو مقصود سمجھتے ہیں اسی غلطی کو میں بیان کررہاہوں۔

نسبت کی اقسام

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ نسبت کہتے ہیں لگاؤ اور تعلق کو اور اس نسبت کی دو قسمیں ہیں (لاکھوں روپے کی بات ہے جو میں بتلارہاہوں) ایک قسم تو یہ ہے کہ بندہ کو

(۱) بناوٹ اور رسم (۲) بادشاہوں کے تکبر سے تو صوفیاء کے ساتھ نسبت ہونا بھی غنیمت ہے (۳) اسی غلطی میں مبتلاء ہیں اور اس کو کمال سمجھتے ہیں (۴) اعمال کا اتنا اہتمام نہیں جتنا وظیفوں کا۔

خدا سے نسبت ہو اور خدا کو بندہ سے نہ ہو اور دوسری قسم یہ کہ بندہ کو خدا سے نسبت ہو اور خدا تعالیٰ کو بندہ سے ہو۔ نسبت کا لفظ لغتاً دونوں قسموں پر بولا جاسکتا ہے مگر مطلوب نسبت کی صرف یہ دوسری قسم ہے نہ کہ پہلی قسم ورنہ ایسا تو کوئی بھی آدمی نہ نکلے گا جو پہلی قسم کی نسبت نہ رکھتا ہو، ایسا کون شخص دنیا میں ہوگا جو خدا کا قائل ہو اور بزعم خود خدا سے تعلق نہ رکھے اور اس کی تدبیر نہ کرے اس کی دلیل قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے مشرکین کا قول نقل کیا ہے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلْفَىٰٓ یعنی مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ان کی پرستش اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو حق تعالیٰ کے قرب میں پہنچادیں تو اس غرض حصول قرب الی اللہ سے مشرکین بھی خالی نہ ہوئے اور یہود اور نصاریٰ تو اہل کتاب ہی ہیں وہ تو کتاب کو حکم الٰہی سمجھ کر اس کو ذریعہ رضاء قرب کیوں نہ بناتے تو پہلی قسم نسبت کی تو ان کو بھی حاصل ہے۔ اگر یہ کافی ہوتی تو پھر خود اسلام کی کچھ ضرورت نہ ہوتی اور نماز روزہ کا تو کیا ذکر دیکھئے کیسی صاف غلطی ہے۔ پس یہ لفظ کہ فلانے صاحب نسبت ہیں خوش کن تو بہت ہے لیکن جب تک کہ یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ کون سی قسم کے صاحب نسبت ہیں اس وقت تک اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہی نسبت رکھتے ہوں جو کفار کو بھی حاصل ہے جو کسی درجہ میں بھی مطلوب اور محمود نہیں۔

نسبت محمود

نسبت اگر قابل شمار اور مطلوب ہے تو دوسری قسم کی ہے یعنی یہ کہ بندہ کو خدا سے ہو اور خدا کو بندہ سے ہو اس میں رضا ہوتی ہے یہ ہے تحقیق نسبت کی اور یہ نسبت اعمال میں اہتمام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی واسطے آگے فرماتے ہیں وَهُوَ وَلِيُّهُم بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ یعنی جو کچھ یہ عطا ہوگا وہ اس کی بدولت ہوگا کہ جو وہ عمل کرتے ہیں یعنی آفات سے حفاظت اور راحتوں کا نصیب ہونا اور ہمارا قرب یہ سب اعمال سے ہوگا کوئی خالی محبت میں مغرور نہ ہوجائے خوب سمجھ لے کہ ہم بلاعمل نہیں مل سکتے اور ان کی تو بڑی شان ہے کبھی کسی کو دنیا میں بھی کوئی محبوب بلاعمل ملا ہے، ذرا سا طبیعت کا لگاؤ کسی سے ہوجاتا ہے تو اس کی کتنی ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں اور کتنی

مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں روپیہ مٹی کر دیا جاتا ہے جان خاک میں مل جاتی ہے مدتوں حیران رہنا پڑتا ہے نہ دن کو چین نہ رات کو نیند، مال دولت سب برباد ہوجاتا ہے تب کہیں منہ لگاتے ہیں عاشق کی جو گت بنتی ہے دنیا جہان کو معلوم ہے کچھ شرح کی ضرورت نہیں عشق کا نام آنا تھا اور جان اور مال سے ہلاک اور برباد ہونا۔ جب دنیا کا ادنیٰ سا محبوب لڑکا یا عورت بھی بلا محنت نہیں ملتا تو حیرت کی بات ہے کہ خدا کی نسبت یوں خیال رکھا جاے کہ بلا محنت مل سکتا ہے عمل اس محنت ہی کو تو کہتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی تلاش میں کچھ بھی محنتیں نہیں رکھیں وہ طریقے بتلائے ہیں جن کو اگر ان مشقتوں کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھا جائے جو ادنیٰ سے ادنیٰ اور گندے ایک دنیاوی محبوب کے لیے کرنا پڑتی ہیں تو معلوم ہوسکتا ہے کہ کچھ بھی مشقت نہیں ہے دنیا کا محبوب روپیہ بھی مانگتا ہے اور اس کے لیے کوئی مقدار مقرر نہیں کرتا نہ کوئی نصاب ہے نہ کوئی وقت ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ سارا ہی روپیہ چاہیے اور جان بھی مانگتا ہے اس کے لیے بھی کوئی قاعدہ یا کوئی وقت مقرر نہیں اس کا بھی مطلب یہی ہوا کہ جان بھی بلا عذر ہمارے اوپر قربان کردو خواہ تمہارا کوئی کام دنیا یا دین بگڑے یا بنے ہم کو اس سے بحث نہیں۔

محبوب حقیقی کے مالی مطالبہ کی کیفیت

اس کے مقابلہ میں محبوب حقیقی کو دیکھئے کہ روپیہ ہی مانگتے ہیں تو کتنا چالیس میں سے ایک اور پھر اس کے لیے بھی شرائط ہیں مثلاً حولان حول یعنی سال بھر گزر جائے تب چالیس میں سے ایک دینا ہوتا ہے اور مثلاً نصاب یعنی مقدار خاص مال کی بھی جیسے ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے ساتھ تولہ سونا(۱) چنانچہ جس کے پاس اتنی مقدار نہ

(۱) ساڑھے سات تولہ کا نصاب جب ہے کہ چاندی اور نقد رقم بالکل نہ ہو اور اگر سونے کے ساتھ چاندی یا نقد رقم ہے تو پھر ساڑھے سات تولہ سونے کا نصاب نہیں بلکہ سونے کی قیمت لگائیے جائیگی اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوگی تو زکوٰۃ واجب ہوجائیگی جیسے آج کل سونا سوا دو لاکھ روپے تولہ ہے۔ اس کے مقابلے میں چاندی بہت سستی ہے 1700ء یا 2000 روپے تولہ ہے لہٰذا اگر کسی کے پاس صرف 4 تولہ سونا اور 5 تولہ چاندی ہو یا اس کے بقدر رقم ہو تو سونے کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب سے صاحب نصاب شمار ہوگا کیونکہ اس میں غریب کا بھلا ہے۔

ہو اس کو ذرا بھی نہیں چھیڑتے یعنی اس پر بلا اس مطالبہ کے ہی عنایت فرماتے ہیں۔ اگر مقدار بھی ہو اور سال بھی گزر چکا ہو لیکن قرض اس کے ذمہ ہو تب بھی اس سے مطالبہ نہیں کرتے یہ تو مالی مطالبہ کی کیفیت ہے اب جانی مطالبہ کو لیجئے اس میں بھی کوئی کام ایسا سر نہیں ڈالتے جس میں نا قابل تحمل مشقت ہو مثلاً پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے اس کے بھی قواعد اور شرائط ایسے نرم ہیں جس کی نظیر ادنی سے ادنیٰ حاکم کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی اور محبوبوں کا برتاؤ تو الگ رہا۔ مثلاً نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کا حکم ہے اگر نہ ہو سکے بیٹھ کر پڑھ لو، اگر بیٹھ کر بھی نہ ہو سکے لیٹ کر پڑھ لو وضو نہ ہو سکے تو ایک بہت آسان بدل اس کا تیمم مقرر کر دیا ہے، سفر میں دو ہی رکعت پڑھ لو غرض تمام جانی اعمال کو اور مالی اعمال کو ان اعمال سے موازنہ کر کے دیکھو جن کا مطالبہ محبوبان دنیا کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ کے مطالبات عشر عشیر (۱) بھی نہیں حالانکہ اگر اس کے برعکس ہوتا یعنی حق تعالیٰ کے مطالبات عشاق سے بہ نسبت مطالبات محبوبان دنیا کے دس حصے اور بیس حصے بھی زیادہ ہوتے تو حق تھا لیکن یہ رحمت اور رافت ہی تو ہے کہ اپنے بندوں کو دق (۲) کرنا نہیں چاہتے بلکہ برائے نام حیلہ رکھ کر کچھ دینا اور کرم کرنا چاہتے ہیں مگر ہم کو بھی تو کچھ انصاف کرنا چاہیے اس کی قدر ہم کو یہ کرنا چاہیے تھی کہ دل وجان سے فدا ہو جاتے اور اس سے زیادہ کر کے دکھاتے جو محبوبان دنیا کے ساتھ کرتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے کشتن بہر او اولیٰ بود (۳)

عشاق نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائی ہیں مجنون کا قصہ سنا ہوگا کہ ایک دفعہ لیلیٰ کے گھر کی طرف چلے اونٹنی پر سوار ہوئے، اونٹنی کے بچہ بھی تھا وہ اونٹنی چلتی اور بار بار پیچھے کو دیکھتی اور ذرا باگ سست (۴) دیکھتی تو پیچھے کو لوٹ پڑتی جب مجنون کو کچھ افاقہ ہوتا تو پھر آگے کو چلاتا مگر اس طرح چلنے سے راستہ کچھ بھی قطع نہ ہوا، آخر سمجھا کہ بچہ کی محبت اس کو روک رہی ہے تو کہتا ہے۔

(۱) دسواں حصہ بھی نہیں (۲) تنگ کرنا (۳) ''محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے'' (۴) لگام ڈھیلی چھوڑی۔

هو ناقتی خلفی و قدامی الهوی فانی وایاها لمختلفان

یعنی میری اونٹنی کا محبوب پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے، میں آگے جانا چاہتا ہوں اور وہ پیچھے جانا چاہتی ہے میری اور اس کے ارادہ میں ضدین کا تقابل ہے یہ ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ لہٰذا چھوڑو اسے، اب چھوڑنے کی ترکیب یہ بھی تھی کہ اونٹنی کو بٹھا کر اتر کر اس کو چھوڑ کر پیادہ چل دیتا ہے مگر عشق میں اتنا صبر کہاں بس فوراً دھڑام سے اوپر سے گر پڑا (عاشق کو فرصت مصالح کے سوچنے کی کہاں ہوتی ہے) تمام بدن چھت گیا اور خونا خون ہوگیا سر پھوٹ گیا ہاتھ پیر زخمی ہوگئے، اب اُٹھ نہیں سکتا جس غرض کے لیے کودا تھا کہ لیلیٰ کی طرف جلدی سے چل دے وہ بھی حاصل نہ ہوئی تو پڑے پڑے کہتا ہے کہ پیروں سے نہیں چل سکتا تو لڑھک کر تو چل سکتا ہوں، بس لڑھکنا شروع کیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے کشتن بہر او اولیٰ بود(۱)

یہ مشقتیں اور محنتیں اٹھائی ہیں عشاق نے جب یہاں کا ایک معشوق بلا محنت نہیں ملتا تو اللہ کیسے مل جائے گا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی عمل نہ کرو، محض یہ خیال دل میں جما کر فرصت سے بیٹھ رہو کہ ہم کو اللہ سے محبت ہے۔ بس کمال بھی ہوگیا اور وصال بھی ہوگیا اور سبھی کچھ ہوگیا۔ حضرت بڑی مشقتیں بڑی محنتیں اٹھانی چاہئیں۔ ایک عاشق کہتا ہے:

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے(۲)

اور بے عمل تو کیا ہوتا عاشق تو عمل کر کے بھی چین نہیں پاتا اس کو تو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے یہ عمل میرا محبوب کی نظر میں آیا یا نہیں اس کو تو اس بیم ورجاء میں ہر وقت موت اور زندگی کا مزہ آتا ہے۔

کشتگاں خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است(۳)

(۱) ''محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے'' (۲) ''صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے'' (۳) ''تسلیم ورضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے''

ہر وقت مرنا ہے اور ہر وقت جینا ہے فارغ کسی وقت نہیں بیٹھ سکتا اس کا تو یہ شغل رہتا ہے:

اندریں رہ میتراش ومیخراش تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود(۱)

محبت میں چین کہاں

بھلا محبت اور چین استغفراللہ وظیفے گھونٹ کر عاشق کیا چین پاتا جان ومال کھپا کر بھی اس کو چین نہیں آتا اس کے وظیفے تو یہ ہیں:

افروختن وسوختن وجامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت(۲)

عاشق یہ وظیفے گھوٹتا ہے اور ایسے گھوٹتا ہے کہ دوسرا کوئی گھوٹ ہی نہیں سکتا، ساری دنیا اس میں اسی کی شاگرد ہے جو کوئی بھی ان اشغال میں دم بھرتا ہے تو اسی کی نقل کرتا ہے ان محنتوں سے آدمی محب کہا جاسکتا ہے کہ بلاعمل صرف خیال باندھ لینے سے اسی کو فرمایا ہے بماکانوایعملون (ان کے اعمال کی وجہ سے) اب اس غلطی کا پورا دفعیہ ہوگیا کہ بدحواسی میں آکر محبت کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور عمل کی ضرورت کا انکار یا عمل کے اہتمام میں تساہل (۳) کرتے ہیں۔ صاف فرمادیا کہ یہ سب نتائج ہیں عمل کے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ عرض کرتا ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ اس روز اسلام کامل کی فضیلت بیان ہوئی تھی آج اسلام کامل کے ثمرات کا بیان ہوا، اسلام کامل کی حقیقت کو بھی اس وقت مختصراً اعادہ کیے دیتا ہوں تاکہ اس کے حاصل کرنے میں سہولت ہو اور اس پر یہ ثمرات مرتب ہوں جو آج بیان ہوئے اسلام کامل کا خلاصہ انقیاد ہے یعنی سپرد کردینا اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے تکوینی احکام اور حوادث میں بھی اور تشریعی احکام اور اعمال میں بھی اور سپرد کردینے کے معنی یہ ہیں کہ ان سب باتوں میں یہ پیش نظر رکھے کہ کوئی بات

(۱) ''اس راہ سلوک میں اُدھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو، آخر دم تک بے کار نہ رہو، آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی'' (۲) ''روشن ہونا، جلنا، بھننا اور کپڑے پھاڑنا، پروانہ، شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے'' (۳) سستی۔

حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف مجھ سے نہ ہونے پائے تکوینی احکام میں تو اس طرح کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور ہر حال میں راضی رہے اور حق تعالیٰ کو راضی رکھے کہ نہ خوشی میں کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف کرے نہ رنج میں بس اپنے آپ کو بندہ سمجھے جس طرف کو وہ چلائیں اس طرف کو چلے۔ حق تعالیٰ کو اپنی جان میں مال میں ہر قسم کے تصرفات کا مختار سمجھے اور تشریعی احکام میں اس طرح کہ شریعت کو ہر وقت پیش نظر رکھے، ہوائے نفسانی اور اغراض کو امام نہ بناوے بلکہ شریعت کو امام بناوے، خواہ وہ حکم اپنی طبیعت کے موافق ہو یا مخالف کسی قسم کی تاویل وتحریف وقطع برید نہ کرے جس طرف شریعت چلاوے اس طرف چلے اور دین کے تمام اجزاء کو کامل کرے صرف نماز پڑھ لینے سے اور روزہ رکھنے سے دین کا کمال نہیں ہوتا، دین کے اجزاء پانچ ہیں، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق ان سب کی تکمیل کر لینے سے کہا جائے گا کہ اسلام کامل ہوا اور ان سب کی تکمیل کے لیے کچھ محنت بھی اٹھائے نرے وعظ سننے اور ثمرات کی تمنا کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بتمنا گریستن (۱)

اگر آدمی کھانا نہ پکائے فقط کھانوں کا تصور دل میں کرتا رہے اور مزے لیتا رہے تو اس سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اجزائے دین کا طریق تکمیل

نیز ان اجزاء کی تکمیل کے لیے ضرورت ہوگی علم کی اس کو بھی حاصل کیجئے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سب باقاعدہ مولوی بن جائیں بلکہ علم کے معنی ہیں جاننا۔ اجزاء دین کو معلوم کر لیجئے جس سے جس طرح ہو سکے جس کو فرصت ہو باقاعدہ مولوی بنے اور جو باقاعدہ مولوی نہ بن سکے تو اردو فارسی کی کتابوں ہی سے دین کی واقفیت پیدا کرے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکے تو مولویوں کے پاس نشست برخاست (۲) رکھے جو کام کرے

(۱) ''غرفی اگر رونے دھونے سے وصال میسر ہو سکتا ہے تو میں اس تمنا میں سو سال رو سکتا ہوں'' (۲) علماء کی خدمت میں آیا جایا کرے۔

ان سے پوچھ کر کرے اگر کوئی مولوی بھی اس طرح کا قریب میں نہ ہو تو آج کل تو ڈاک کا راستہ کھلا ہوا ہے دو چار پیسے میں جو چاہو معلوم کرلو(۱)، یہ بھی ایک طریقہ ہے علم حاصل کرنے کا۔ غرض غافل نہ رہو ہر وقت خیال رکھو کہ کوئی بات حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور مسئلے مسائل کا بھی مشغلہ رکھو جہاں اور بہت سے کام ہیں ایک یہ کام بھی اپنے ذمہ سمجھو اور اس کے واسطے کچھ اپنا حرج اور مشقت بھی گوارا کرو نری تمناؤں پر اکتفا نہ کرو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لو كان هذاالعلم يدرك بلمنى ماكان يبقى فى البرية جاهل
فاجهد ولا تكسل ولا تك غافلا فندامة العقبى لمن يتكاسل

یعنی اگر یہ علم نری تمناؤں سے حاصل ہوجایا کرتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا، کوشش کرو اور سستی مت کرو اور غافل مت رہو کیونکہ آخرت کی ندامت اسی شخص کو ہوگی جو سستی کرے گا۔

بیداری اور ہمت کی ضرورت

اگر محض تمنا سے کچھ ہوجایا کرتا تو ساری دنیا کامل ہوجاتی ہے اس کے ساتھ دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ بیداری اور ہمت یعنی ہر وقت ہوشیار بھی رہو کہ تمہارے پیچھے نفس و شیطان بڑے دشمن لگے ہوئے ہیں ان سے دھوکہ مت کھانا جو کام کرو ان کے کہنے کے موافق مت کرنا حق تعالیٰ کے کہنے کے موافق کرنا یہ تو بیداری ہے اور احکام الٰہی کی پابندی میں طبیعت سستی کرے تو بتکلف کام لو یہ ہمت ہے ہر وقت اسی میں رہو، تب بھی محبوب مل جاوے تو غنیمت ہے۔ اسلام کامل کا تو یہ حاصل ہوا اور ثمرات کا بیان آپ نے آج سن ہی لیا۔ پس اسلام کامل حاصل کیجئے حق تعالیٰ اس پر ثمرات ضرور مترتب فرماویں گے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم اور ہمت عطا فرماویں۔

دعوتم بحمداللّٰہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات وصلی اللّٰہ تعالٰی علیٰ

(۱) اور اب تو موبائل فون اس سے بھی آسان راستہ ہے فوراً مسئلہ پتہ لگ جائے گا۔

سید الکائنات صلوٰۃ تسبق الغایات۔

التماس

احقر نے بمعاونت اپنے ایک مخلص دوست منشی ولی محمد صاحب پنجابی حال مقیم میرٹھ کے یہ وعظ از جانب اپنے والد ماجد مرحوم کے لکھا ہے۔ ناظرین ان کے واسطے دعا فرماویں اور جب وعظ ہذا کا مطالعہ ختم کریں یہ دعا پڑھیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ -رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا -رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ-رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

اور ناظرین حضرت مولانا کے واسطے بھی دعا کریں کہ یہ جو کچھ ہے سب حضرت ہی کی برکت ہے اور اخیر میں احقر اور منشی ولی محمد صاحب کے لیے بھی دعا کریں۔ والسلام (۱)

---

(۱) اپنی دعاؤں میں منشی اس کے والدین اور اولاد اور بھائی بہنوں کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب کو ایمان کامل ودائم عطا فرمائیں۔ آمین

فقط خلیل احمد تھانوی

5-/2/23

أخبار الجامعة

ماہ مئی 2023ء

حضرت مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ (مہتمم جامعہ) نے اس سال نصف رمضان المبارک دبئی میں گزارا جہاں عالمِ اسلام کے 68 ممالک سے منتخب حفاظ وقراء کرام کے مابین مسابقہ میں ججمنٹ فرمائی۔ دوسرا نصف رمضان المبارک ملک پاکستان میں گزرا اِن ایام میں جامعہ وبیرون جامعہ تراویح میں تکمیل قرآن کی مختلف تقاریب میں شرکت فرما کر تلاوت اور بیان کا سلسلہ جاری رہا۔

❁ 24 اپریل 2023ء: حضرت مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ العالی مہتمم جامعہ ہٰذا نے مولانا محمد اکرام استاذ جامعہ ہٰذا کی بیٹی کا نکاح جامع مسجد گنگ محل گلبرگ لاہور میں پڑھایا۔

❁ 28 اپریل: مولانا قاری صدام حسین استاذ جامعہ کا نکاح پڑھایا۔

❁ 7 مئی: جامعہ ہٰذا میں تقریب افتتاح بخاری شریف ہوئی اس موقع پر اعلان کیا گیا کہ اس سال مولانا محمد مالک کاندھلویؒ کے بیٹے مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے پوتے مولانا ڈاکٹر محمد سعد صدیقی صاحب مسلم شریف کے اسباق پڑھائیں گے آپ پنجاب یونیورسٹی سے پروفیسر ریٹائرڈ ہیں اور مسجد عکسِ جمیل سمن آباد کے خطیب ہیں اس کے علاوہ دارالتقویٰ چوبرجی اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں بھی

تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس کے بعد مولانا ڈاکٹر قاری خلیل احمد تھانوی مدظلہ نائب مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ ہٰذا نے بخاری شریف کا درس دے کر نئے تعلیمی سال کا باقاعدہ آغاز فرمایا۔ آپ نے حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سابق شیخ الحدیث ومہتمم جامعہ کے آخری ایام علالت میں حضرت کے حکم سے ہی بخاری شریف کے درس کا آغاز کر دیا تھا۔

تقریب کے آخر میں حضرت مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ مہتمم جامعہ نے قراءات کے اسباق کا آغاز فرمایا اور طلباء واساتذہ کو نئی ہدایات واصول وضوابط سے آگاہ فرمایا اور خالص تعلیمی ماحول میں اپنی تعلیم وتربیّت کی طرف توجہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔

❁ 14 مئی: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی اجازت سے آپ کی سرپرستی میں مولانا ڈاکٹر محمد اشرف علی فاروقی صاحب نے حلال فوڈ سرٹیفکیشن پروگرام ترتیب دیا ہے جس کو بتدریج نصابِ تعلیم میں ضم کر کے طلباء وعلماء کو حلال فوڈ کے بارے میں تربیت دی جائے گی اِس پروگرام کی افادیت واہمیت کے حوالہ سے آگاہی کے لیے مختصر تقریب منعقد ہوئی جس میں محترم نوید صاحب حلال فوڈ ٹیکنالوجسٹ اور مولانا محمد اشرف علی فاروقی معاون نائب مہتمم وقاری رشید احمد تھانوی ناظم امتحانات ورئیس قسم القراءات ومولانا ڈاکٹر قاری خلیل احمد تھانوی نائب مہتمم جامعہ نے حلال فوڈ سے ہر مسلمان کو باخبر رکھنے کے لیے دینی مدارس کے طلباء وعلماء کو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا پروگرام کے آخری صدراتی کلمات میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے طلباء کو ترغیب دی کہ آپ لوگ ہی مستقبل میں قائدانہ کردار ادا کر کے ملک وملّت کی قیادت کروگے لہٰذا مولانا

مشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو خواب دیکھا تھا ماشاء اللہ عزیزم ڈاکٹر محمد اشرف علی فاروقی سلّمہٗ جو آپ کے بیٹے ہیں حضرت کے حکم سے ہی ملائشیا یونیورسٹی سے حلال فوڈ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بڑی محنت سے اس موضوع پر کام کیا ہے امید ہے کہ اب نصابِ تعلیم میں داخل ہونے کے بعد اساتذہ کرام طلباء کی تربیت کر کے اس فن میں بھی رجالِ کار پیدا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس نظام کو بھی دیگر شعبہ جات کی طرح کامیاب فرمائیں۔

❁ 19 مئی: جامعہ ہٰذا میں ایک طویل عرصہ سے عازمین حج کی تربیت وراہنمائی کی جاتی ہے جو کہ حضرت مولانا مشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرتب کردہ نظام کے تحت جاری وساری ہے اور اب ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ مہتمم جامعہ ہذا کی سرپرستی میں آپ کے برادر عزیز مولانا ڈاکٹر قاری خلیل احمد تھانوی نائب مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں یہ پروگرام 19 تا 21 مئی تین روزہ تھا اور خواتین کے لیے بھی باپردہ نظام کے ساتھ راہنمائی کی گئی خواتین کے حلقہ میں مولانا مشرف علی تھانویؒ کی اہلیہ محترمہ راہنمائی فرماتی ہیں، ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی دامت برکاتہم نے پہلے روز حج کی اہمیت اور فضائل پر گفتگو کرنے کے بعد عمرہ کا مکمل طریقہ لوگوں کو بتایا اور احرام باندھنے کا عملی طریقہ چادر باندھ کر لوگوں کو سکھایا گیا اس موقع پر حضرت مولانا مشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی تحریر فرمودہ رہنمائے حجاج ،مناجات مقبول اور طواف کی دعاؤں پر مشتمل کتابچے بھی لوگوں کو ہدیہ کئے گئے۔ دوسرے روز ارکان حج کی تفصیلی تربیت کی گئی۔جس میں منٰی ،عرفات، مزدلفہ اور رمی جمرات کے اعمال کا تذکرہ اور ان کو صحیح طریقہ پر ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا اور تلبیہ بھی لکھ کر دیا گیا کہ سب لوگ یاد کرلیں، نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔ تیسرے دن مدینہ منورہ

میں حاضری روضۂ اقدس پر سلام پیش کرنے کے آداب کو تفصیل سے بیان کیا گیا بعد ازاں ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ العالی نے پروگرام کے آخر میں دعائیہ کلمات کے ساتھ پروگرام کا اختتام فرمایا۔

❁ 20 مئی: حضرت مہتمم صاحب (زید مجدہٗ) نے مدرسہ بیت النور پی آئی اے سوسائٹی لاہور تقریب افتتاح بخاری شریف میں تلاوتِ قرآن سے نئے تعلیمی سال کا آغاز فرمایا۔